حکمت قرآن ـــــ نئے دور کا آغاز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والا ماہنامہ ''حکمت قرآن'' بحمد اللہ مسلسل طباعت کی تیسری دہائی کے آخری حصے میں ہے۔ یہ عرصہ ربع صدی سے زیادہ کو محیط ہے۔ ۱۹۸۲ء کے اوائل میں جب اس جریدے کا اجراءِ ثانی برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے کیا تو اس وقت کتابت اور طباعت کے انداز پرانے تھے اور ان کے جملہ مراحل میں بہت محنت صرف ہوتی تھی۔ یادش بخیر' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہنامہ ''میثاق'' کی طرح یہ رسالہ بھی چند اشاعتوں کے بعد بند ہونے اور ڈیکلریشن surrender کیے جانے پر دوبارہ اپنے نام پر حاصل کرنے کے بعد شائع کرنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے مؤسس اوّلین ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کا نام اس کے سرورق پر تا حال چھپ رہا ہے' پہلے پہل جاری کنندہ کے حوالے سے اور بعد ازاں بیادگار ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم۔ برادر محترم نے باقاعدہ اشاعت کے دوسرے پرچے (بابت مئی' جون ۱۹۸۲ء) میں اس دلچسپ صورت حال کے ضمن میں علامہ اقبال کی معرکۃ الآراء نظم ''ذوق وشوق'' کا یہ شعر بھی تحریر کیا تھا: ؎

میں کہ میری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکمت قرآن کے اجراء میں اوّل روز سے ہی صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ عام مروّجہ سطحی روش سے ہٹ کر اس پرچے میں ایسے علمی مضامین کو شائع کیا جائے جو ایک طرف گہری قرآنی بصیرت اور ذہنی کاوش کے اعلیٰ نمونے ہوں' اور جدید علمی و تحقیقی محاسن سے آراستہ ہوں تو دوسری طرف ان کا بنیادی مقصد یہ ہو کہ وہ متلاشیانِ حق کو عمل پر ابھاریں' اور ذہنی و قلبی کیفیات ان نظریات کے زیر اثر مترتب ہوں۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو صرف زبان تک محدود ہے۔ یہ تو خلق اللہ پر بمنزلہ دلیل و حجت ہوا۔ دوسرا دل سے لگاؤ رکھتا ہے۔ یہی علم نافع ہے''۔ اس وقت راقم کے سامنے ابتدائی دو سال (۸۳-۱۹۸۲ء) کے شماروں کی جلد ہے' جس کی ورق گردانی سے ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا کہ کتنے ہی وہ اہل علم جن کی رشحاتِ قلم اس جریدے میں چھپیں' وہ اب ہمارے درمیان موجود نہیں' بلکہ اپنے ربّ کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ ان میں نمایاں نام پروفیسر یوسف سلیم چشتی' مولانا سید حامد میاں' مولانا محمد طاسین' پروفیسر مرزا محمد منور' چوہدری مظفر حسین' ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ اور پروفیسر حافظ احمد یار ہیں۔ دعا ہے کہ ربّ کریم ان سب کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین!

عالمی فکر اور نگارشات پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کے بارے میں انتہائی منفی رویہ موجود ہے، وہاں دوسری طرف مغربی دنیا ہی میں اسلام کی حقانیت اور حکمت قرآنی کی جانب انتہائی مثبت رویہ بھی نظر آتا ہے جو شاید اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ آخری زمانے میں اسلام ایک بار پھر عالمی سطح پر غالب ہوگا۔ اوّل الذکر رویے کا سرخیل برنارڈ لوئس ہے، جس نے اپنی تصنیف

"What Went Wrong: The Clash between Islam and Modernity in the Middle East"

میں اسلام کو ایک گلی سڑی، بوسیدہ اور ناکام تہذیب قرار دیا ہے۔ یہی معاملہ ٹونی بلینکلے کی کتاب

The West's Last Chance: Will We Win the Clash of Civilizations?

اور رالف پیٹرز کا ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف شدید ہرزہ سرائی کی ہے اور مسلمانوں کو شیطان اور تہذیب وتمدن کا روسیاہ دشمن قرار دیا ہے۔

دوسری جانب ہمیں مغربی دنیا ہی میں متعدد دانشور اور اہم شخصیات ایسی نظر آ رہی ہیں جو عالم اسلام کے بارے میں مغرب اور بالخصوص امریکہ کے رویے کی شدید ناقد ہیں اور قرآن کی تعلیمات اور فلسفۂ حیات کی تائید میں ایک زوردار آواز بلند کر رہی ہیں۔ ان میں سرفہرست انگلستان کے آرچ بشپ آف کنٹر بری ارون ولیمز ہیں جنہوں نے حال ہی میں واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ برطانیہ میں اسلامی شریعت کے قانون کو اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ انہوں نے مزید کہا: ''یورپ کی انسانی حقوق کی عدالت نے جو یہ کہا ہے کہ اسلام کا شرعی قانون جمہوری اقدار کے منافی ہے، تو یہ بالکل غلط کہا ہے۔ کسی قانون کو محض اس لیے ردّ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہماری سوچ اور عقل کے مطابق نہیں''۔ آرچ بشپ کے اس بیان کا ردّعمل اگرچہ نہایت مخالفانہ رہا، لیکن انہوں نے اپنے خیالات سے تائب ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک اہم امریکی دانشور مائیکل ولاہوس نے گزشتہ برس فروری میں ایک انتہائی اہم مضمون ''The Fall of Modernity'' کے عنوان سے لکھا اور انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلایا۔ جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے، ولاہوس کا مدلل فکر یہ ہے کہ امریکہ عالم اسلام اور تیسری دنیا کے ممالک میں اپنی پالیسیوں کے ذریعے اپنے مزعومہ لبرل اور روشن خیال فلسفے کی جڑیں خود اکھاڑ رہا ہے۔ اس کی تحریر کا پہلا جملہ:

"We are losing our wars in the Muslim world because our vision of history is at odds with reality."

بڑا معنی خیز ہے۔ اور اس نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اسلام اور عالمِ اسلام کے خلاف شدید ناانصافی اور علمی جہالت پر مبنی معاملہ کیا ہے۔

اس مختصر شذرہ میں راقم ایک اور مغربی دانشور خاتون کیرن آرمسٹرانگ کا ذکر بھی مناسب سمجھتا ہے جنہوں نے گزشتہ ماہ پاکستان کا دورہ کیا اور تین مقامات یعنی اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں فکر انگیز خطابات

(باقی صفحہ 88 پر)

بقیہ: حرفِ اوّل

کیے۔ لاہور کے لیکچر میں مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ کیرن آرمسٹرانگ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں اور ہر دو کے بارے میں گہری علمی بنیادوں پر مثبت رویہ رکھتی ہیں۔ جس عقیدت اور احترام سے وہ آنحضور ﷺ کا نام نامی لیتی رہیں اس سے بھی اس مثبت رویہ کا اظہار ہوتا تھا۔ کیرن آرمسٹرانگ کے اس تجزیے سے مجھے بوجوہ اتفاق نہیں کہ اگر عالم اسلام غزالی' ابن رشد اور ابن تیمیہ کے قد کاٹھ کے دس عالم باصفا ''Sages'' پیدا کر لے تو اپنے زوال اور نکبت کے دور سے باہر آ سکتا ہے۔ میں اسے ان کی خوش فہمی پر ہی محمول کروں گا' کیونکہ علماء اور مفکرین کے افکار غلبہ و سیاسی اقتدار (empowerment) کے بغیر مؤثر نہیں ہو سکتے اور ریاست اور تہذیب و تمدن کی سطح پر کوئی انقلابی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

''حکمت قرآن'' کا یہ شمارہ ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہے۔ انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی کے اکیڈمک ونگ نے طویل سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اس جریدے کو ظاہری اور معنوی لحاظ سے وقیع بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے سہ ماہی بنایا جائے' تاکہ ادارتی عملے کو اس کے مشمولات کی تدوین کے لیے زیادہ وقت ملے۔ قارئین کے لیے ایک اور خوش آئند خبر یہ ہے کہ ''حکمت قرآن'' کے بانی ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے فکر کی اشاعت کے لیے قائم کردہ فاؤنڈیشن بھی اب لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت سرگرم عمل ہے اور آپ کی تصانیف کی پرنٹنگ کے انتظامات کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن اکیڈمی میں گزشتہ دو سال سے قائم اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ سیکشن کے محققین کی رشحاتِ قلم بھی اس پرچے کی زینت بنیں گی۔ بحمداللہ عزیزی پروفیسر عاطف وحید کی زیرنگرانی اس شعبے میں کام کرنے والے نوجوانوں کا شمار ''رَاسِخُون فی العلم'' میں ہوتا ہے اور قارئین ان کی تحریروں کے حوالے سے ان سے پہلے سے ہی واقف ہوں گے۔

❁❁❁

''اسلام مکمل دین ہے' ضابطۂ حیات نہیں.....؟''

(اسلامی نظریاتی کونسل کی وضاحت)

حکمت قرآن دسمبر 2007ء کا اداریہ مندرجہ بالا عنوان کا حامل تھا اور اس میں 7 نومبر 2007ء کے نوائے وقت میں شائع ہونے والے جناب ڈاکٹر خالد مسعود' چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل سے منسوب ایک انٹرویو کو زیر بحث لایا گیا تھا۔ اس پر ہمیں اسلامی نظریاتی کونسل کے سیکرٹری ریاض الرحمٰن صاحب کی جانب سے ایک مراسلہ موصول ہوا ہے کہ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے ایسا کوئی اخباری بیان نہیں دیا اور نوائے وقت میں اس مبینہ انٹرویو کی اشاعت کے بعد اس کی تردید تمام اخبارات کو ایک پریس ریلیز کے ذریعے بھیج دی گئی تھی۔ oo

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۲۴۳ تا ۲۵۳

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَہُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ۪ فَقَالَ لَہُمُ اللّٰہُ مُوۡتُوۡا ۟ ثُمَّ اَحۡیَاہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقۡبِضُ وَیَبۡصُۜطُ ۪ وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّہُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ قَالَ ہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ وَلَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ وَزَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اٰیَۃَ مُلۡکِہٖۤ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ التَّابُوۡتُ فِیۡہِ سَکِیۡنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَبَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوۡسٰی وَاٰلُ ہٰرُوۡنَ تَحۡمِلُہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَہَرٍ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡہُ فَلَیۡسَ مِنِّیۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ یَطۡعَمۡہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡۤ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَۃًۢ بِیَدِہٖ ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡہُ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَہٗ ہُوَ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ ۙ قَالُوۡا لَا طَاقَۃَ لَنَا الۡیَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِہٖ ؕ قَالَ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰہِ ۙ کَمۡ مِّنۡ فِئَۃٍ قَلِیۡلَۃٍ غَلَبَتۡ فِئَۃً کَثِیۡرَۃًۢ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِہٖ قَالُوۡا

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۠ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

اب جو دو رکوع زیر مطالعہ آ رہے ہیں یہ اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اس جنگ کا تذکرہ ہے جس کی حیثیت گویا تاریخ بنی اسرائیل کے غزوۂ بدر کی ہے۔ قبل ازیں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ حضرت موسیٰ d کے بعد بنی اسرائیل نے یوشع بن نون کی سرکردگی میں جہاد و قتال کیا تو فلسطین فتح ہو گیا۔ لیکن انہوں نے ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی بارہ حکومتیں بنا لیں اور آپس میں لڑتے بھی رہے۔ لیکن تین سو برس کے بعد پھر یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ جب ان کے اوپر دنیا تنگ ہو گئی اور آس پاس کی کافر اور مشرک قوموں نے انہیں دبا لیا اور بہت سوں کو اُن کے گھروں اور ان کے ملکوں سے نکال دیا تو پھر تنگ آ کر انہوں نے اُس وقت کے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ یعنی سپہ سالار مقرر کر دیجیے‘ اب ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ چنانچہ وہ جو جنگ ہوئی ہے طالوت اور جالوت کی‘ اس کے بعد گویا بنی اسرائیل کا دورِ خلافت راشدہ شروع ہوا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ دور جسے میں ’’خلافت راشدہ‘‘ سے تعبیر کر رہا ہوں‘ ان کے رسولؑ کے انتقال کے تین سو برس بعد شروع ہوا‘ جبکہ اِس اُمت مسلمہ کی خلافت راشدہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ متصل ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام j نے جانیں دیں‘ خون دیا‘ قربانیاں دیں اور اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں دین غالب ہو گیا اور اسلامی ریاست قائم ہو گئی۔ نتیجتاً آپؐ کے انتقال کے بعد خلافت کا دَور شروع ہو گیا‘ لیکن وہاں تین سو برس گزرنے کے بعد ان کا دَورِ خلافت آیا ہے۔ اس میں بھی تین خلافتیں تو متفق علیہ ہیں۔ یعنی حضرت طالوت‘ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان e کی خلافت۔ لیکن چوتھی خلافت پر آ کر تقسیم ہو گئی۔ جیسے حضرت علی h خلیفۂ رابع کے زمانے میں عالم اسلام منقسم ہو گیا کہ مصر اور شام نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح فلسطین کی مملکت حضرت سلیمانؑ کے دو

بیٹوں میں تقسیم ہوگئی' اور اسرائیل اور یہود یہ کے نام سے دو ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ قرآن حکیم میں اس مقام پر طالوت اور جالوت کی اس جنگ کا تذکرہ آ رہا ہے جس کے بعد تاریخ بنی اسرائیل میں اسلام کے غلبے اور خلافتِ راشدہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ درحقیقت صحابہ کرام j کو ایک آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ اب یہی مرحلہ تمہیں درپیش ہے' غزوۂ بدر پیش آیا چاہتا ہے۔

آیت ۲۴۳ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ﴾ ''کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو نکل کھڑے ہوئے اپنے گھروں سے''

﴿وَهُمۡ اُلُوۡفٌ﴾ ''جبکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے''

﴿حَذَرَ الۡمَوۡتِ ۪﴾ ''موت کے ڈر کی وجہ سے۔''

یعنی جب کفار اور مشرکین نے ان پر غلبہ کر لیا اور یہ دہشت زدہ ہو کر' اپنے ملک چھوڑ کر' اپنے گھروں سے نکل بھاگے۔

﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ۟﴾ ''تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ!''

﴿ثُمَّ اَحۡیَاهُمۡ ؕ﴾ ''پھر (اللہ نے) انہیں زندہ کیا۔''

یہاں موت سے مراد خوف اور بزدلی کی موت بھی ہو سکتی ہے جو اُن پر بیس برس طاری رہی' پھر سیموئیل نبی کی اصلاح و تجدید کی کوششوں سے ان کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی اور اللہ نے ان کے اندر ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ گویا یہاں پر موت اور احیاء سے مراد معنوی اور روحانی و اخلاقی موت اور احیاء ہے۔ لیکن بالفعل جسدی موت اور احیاء بھی اللہ کے اختیار سے باہر نہیں' اس کی قدرت میں ہے' وہ سب کو مار کر بھی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

اکثر لوگ شکر گزاری کی روش اختیار کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے احسانات کی ناقدری کرتے ہیں۔

اب سابقہ اُمت مسلمہ کے ''غزوۂ بدر'' کا حال بیان کرنے سے پہلے مسلمانوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی ہدایت کے لیے بیان ہو رہا ہے' تاریخ بیان کرنا قرآن کا مقصد نہیں ہے۔ یہ تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کی تحریک جس مرحلے سے گزر رہی تھی اور انقلابی عمل جس سٹیج پر پہنچ چکا تھا اس کی مناسبت سے سابقہ اُمت مسلمہ کی تاریخ سے واقعات بھی لائے جا رہے ہیں اور اُسی کی مناسبت سے احکام بھی دیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ۲۴۴ ﴿وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ﴾ ''اور جنگ کرو اللہ

کی راہ میں‘ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۲۴۵ ﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً﴾ ’’کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تو اللہ اس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا رہے۔‘‘

جو انفاق خالص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے کیا جاتا ہے اسے اللہ اپنے ذمے قرضِ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم میرے دین کو غالب کرنا چاہتے ہو‘ میری حکومت قائم کرنا چاہتے ہو‘ تو جو کچھ اس پر خرچ کرو گے وہ مجھ پر قرض ہے‘ جسے میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کروں گا۔

﴿وَ اللّٰہُ یَقۡبِضُ وَ یَبۡصُۜطُ﴾ ’’اور اللہ تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے۔‘‘

اللہ ہی کے اختیار میں ہے کسی چیز کو سکیڑ دینا اور کھول دینا‘ کسی کے رزق کو تنگ کر دینا یا اس میں کشائش کر دینا۔

﴿وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ﴾ ’’اور اسی کی طرف تمہیں لوٹا دیا جائے گا۔‘‘

یہاں دیکھئے جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں چیزوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ جہاد بالنفس کی آخری شکل قتال ہے اور جہاد بالمال کے لیے پہلے لفظ ’’انفاق‘‘ آ رہا تھا‘ اب قرضِ حسنہ لایا جا رہا ہے۔

آیت ۲۴۶ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی﴾ ’’کیا تم نے غور نہیں کیا بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملے میں‘ جو انہیں موسیٰؑ کے بعد پیش آیا؟‘‘

﴿اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّہُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ﴾ ’’جبکہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیجیے‘ تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔‘‘

یہاں بادشاہ سے مراد امیر اور سپہ سالار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی کی موجودگی میں بلند ترین مرتبہ تو نبی ہی کا رہے گا‘ لیکن ایک ایسا امیر نامزد کر دیجیے جو نبی کے تابع ہو کر جنگ کی سپہ سالاری کر سکے۔ میں حدیث بیان کر چکا ہوں کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کوئی نہ کوئی نبی ضرور موجود رہا ہے۔ اُس وقت سیموئیل نبی تھے جن سے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ فرمائش کی تھی۔

﴿قَالَ ہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا﴾ ’’انہوں نے کہا کہ تم سے اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو اُس وقت تم جنگ نہ کرو۔‘‘

یعنی ابھی تو تمہارے بڑے دعوے ہیں‘ بڑے جوش و خروش اور بہادری کا اظہار کر رہے ہو‘ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ میں اللہ تعالیٰ سے جنگ کی اجازت بھی لوں اور تمہارے لیے کوئی سپہ سالار یا بادشاہ بھی مقرر کر دوں اور پھر تم جنگ سے کنی کترا جاؤ؟

﴿قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ ’’انہوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں؟‘‘

﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا﴾ ’’جبکہ ہمیں نکال دیا گیا ہے ہمارے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے۔‘‘

دشمنوں نے ان کے بیٹوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنا لیا تھا اور یہ اپنے ملکوں سے خوف کے مارے بھاگے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اب ہم جنگ نہیں کریں گے تو کیا کریں گے؟

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ﴾ ’’پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی‘‘

﴿تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ ’’تو سب پیٹھ پھیر گئے‘ سوائے ان کی ایک قلیل تعداد کے۔‘‘

یہ گویا مسلمانوں کو تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ تم بھی بہت کہتے رہے ہو کہ حضور ہمیں جنگ کی اجازت ملنی چاہیے‘ لیکن ایسا نہ ہو کہ جب جنگ کا حکم آئے تو وہ تمہیں ناگوار گزرے۔ آیت ۲۱۶ میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ ’’تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے‘‘۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ’’اور اللہ ایسے ظالموں سے خوب باخبر ہے۔‘‘

آیت ۲۴۷ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ ’’اور اُن سے کہا ان کے نبیؑ نے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔‘‘

ان کا نام تورات میں ساؤل (Saul) آیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اصل نام ساؤل ہو‘ لیکن چونکہ وہ بہت قدآور تھے اس لیے ان کا ایک صفاتی نام یا لقب ’’طالوت‘‘ ہو۔ طالوت کے معنی ’’لمبے تڑنگے‘‘ کے ہیں۔

﴿قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا﴾ ’’انہوں نے کہا کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اسے ہمارے اوپر بادشاہت ملے؟‘‘

﴿وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ ’’جبکہ ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں بادشاہت کے‘‘

﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ﴾ ’’اور اسے تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی۔‘‘

وہ تو مفلس ہے‘ اسے تو اللہ تعالیٰ نے زیادہ دولت بھی نہیں دی ہے۔ کیونکہ ان کے معیارات یہی تھے کہ جو دولت مند ہے وہی صاحب عزت ہے۔

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ﴾ ’’نبیؑ نے کہا: (اب جو چاہو کہو) یقیناً اللہ نے اس کو چن لیا ہے تم پر۔‘‘

یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ (Divine Decision) ہے' جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اُسی کو تمہاری سرداری کے لیے چنا ہے۔

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ ''اور اسے کشادگی عطا کی ہے علم اور جسم دونوں چیزوں میں۔''

وہ نہ صرف قد آور اور طاقت ور ہے بلکہ اللہ نے اسے علم اور فہم بھی وافر عطا فرمایا ہے' اسے امورِ جنگ سے بھی واقفیت ہے۔ تمہارے نزدیک عزت اور سرداری کا معیار دولت ہے' مگر اللہ نے اسے ان دو چیزوں کی بناء پر چنا ہے۔ ایک تو وہ جسمانی طور پر مضبوط اور طاقتور ہے۔ اُس دور میں ظاہر بات ہے اس کی بہت ضرورت تھی۔ اور دوسرے یہ کہ اسے علم' فہم' سمجھ اور دانش دی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی بادشاہت دے دیتا ہے۔'' اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جس کو چاہے دے' وہ جسے چاہے اپنی طرف سے اقتدار بخشے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ ''اور اللہ بہت سمائی والا ہے' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس کی وسعت اتھاہ ہے' کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا' اور وہ بڑا علم رکھنے والا ہے' سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو جو کچھ دیتا ہے بر بنائے علم دیتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے۔

آیت ۲۴۸ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ ''اور ان سے کہا ان کے نبی نے کہ طالوت کی بادشاہت کی ایک نشانی یہ ہوگی کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا (جو تم سے چھن چکا ہے) جس میں تمہارے لیے تسکین کا سامان ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور کچھ آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں' وہ صندوق فرشتوں کی تحویل میں ہے۔''

طالوت کی امارت اور بادشاہی کی علامت کے طور پر وہ صندوق تمہارے پاس واپس آ جائے گا۔ اصل میں یہ ''تابوتِ سکینہ'' لکڑی کا ایک بہت بڑا صندوق تھا' جس میں بنی اسرائیل کے انبیاء کرام f کے تبرکات محفوظ تھے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ صندوق اب بھی مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگ میں موجود ہے۔ انہوں نے بعض ذرائع سے فوٹو لے کر اس کی دستاویزی فلم بھی دکھا دی ہے۔ یہ ''تابوتِ سکینہ'' حضرت سلیمان d کے تعمیر کردہ ہیکل کے تہہ خانے میں رکھا ہوا تھا اور وہیں پر ربائی (رَبَّانِیِّیْنَ) بھی موجود تھے۔ جب اس ہیکل کو منہدم کیا گیا تو وہ اسی میں دب گئے۔ وہ تہہ خانہ چاروں طرف سے بند ہو گیا ہوگا اور ان کی لاشیں اور تابوتِ سکینہ اس کے اندر ہی ہوں گے۔ تابوت سکینہ میں بنی اسرائیل کے لیے بہت بڑی روحانی تسکین کا سامان تھا کہ ہمارے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون e کے تبرکات ہیں۔ اس میں عصائے

موسیٰ بھی تھا اور وہ الواح بھی جو حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر دی گئی تھیں اور جن پر تورات لکھی ہوئی تھی۔ اس تابوت کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو اسی طرح تسکین ہوتی تھی جیسے ایک مسلمان کو خانۂ کعبہ کو دیکھ کر تسکین ہوتی ہے۔ اسرائیلیوں کو جب ان کے پڑوسی ملکوں نے شکست دی تو وہ تابوت سکینہ بھی چھین کر لے گئے۔ پوری قوم نے اس عظیم سانحے پر ماتم کیا اور اسے بنی اسرائیل سے ساری عزت وحشمت چھن جانے سے تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ اس سے ان کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ اب جبکہ اسرائیلیوں نے جنگ کا ارادہ کیا اور وقت کے نبی حضرت سیموئیل نے طالوت کو ان کا امیر مقرر کیا تو انہیں یہ بھی بتایا کہ طالوت کو اللہ کی طرف سے نامزد کیے جانے کی ایک علامت یہ ہوگی کہ تمہاری تسکین کا سامان ''تابوت سکینہ'' جو تم سے چھن گیا تھا' ان کے عہد امارت میں تمہیں واپس مل جائے گا اور اس وقت وہ فرشتوں کی تحویل میں ہے۔ ہوا یہ کہ ان کے دشمن جب تابوت چھین کر لے گئے تو وہ ان کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ وہ اسے جہاں رکھتے وہاں طاعون اور دوسری وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ بالآخر انہوں نے اسے نحوست کا باعث سمجھتے ہوئے ایک چھکڑے پر رکھا اور بیلوں کو ہانک دیا کہ جدھر چاہیں لے جائیں۔ بیل سیدھے چلتے چلتے اسے بنی اسرائیل کے علاقے میں لے آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ فرشتوں کی راہنمائی سے ہوا۔ اس طرح وہ تابوتِ سکینہ ان کے پاس واپس پہنچ گیا جو برسوں پہلے ان سے چھن چکا تھا۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ ''یقیناً اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ماننے والے ہو۔''

آیت ۲۴۹ ﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ﴾ ''پھر جب طالوتؑ اپنے لشکروں کو لے کر چلے''

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَہَرٍ ۚ﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرے گا ایک دریا سے (یعنی دریائے اُردن)۔''

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ﴾ ''تو جو اس میں سے (پیٹ بھر کر) پانی پیے گا وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْٓ﴾ ''اور جو اُس میں سے پانی نہیں پیے گا وہ میرا ساتھی ہے''

﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَۃًۢ بِیَدِہٖ ۚ﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی اپنے ہاتھ سے صرف چلو بھر پانی لے کر پی لے۔''

اصل میں ہر کمانڈر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی بھی بڑی جنگ سے پہلے اپنے ساتھیوں کے جوش و جذبہ اور عزم و حوصلہ (morale) کو پرکھے اور نظم (discipline) کی حالت کو دیکھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی غزوۂ بدر سے قبل مشاورت کی تھی کہ مسلمانو! ایک طرف جنوب سے کیل کانٹے سے لیس

ایک لشکر آ رہا ہے اور دوسری طرف شمال سے مال واسباب سے لدا پھندا ایک قافلہ آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک تمہیں ضرور ملے گا۔ بتاؤ کدھر چلیں؟ کچھ لوگ جو کمزوری دکھا رہے تھے انہوں نے کہا کہ چلیں پہلے قافلہ لوٹ لیں! اور جو لوگ باہمت تھے انہوں نے کہا حضورﷺ! جو آپؐ کا ارادہ ہو، جو آپؐ کی منشا ہو، آپؐ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیے، ہم حاضر ہیں! تو یہاں بھی طالوت نے اپنے لشکریوں کا ٹیسٹ لیا کہ وہ میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ ''تو انہوں نے اس میں سے (خوب جی بھر کر) پانی پیا''

﴿اِلَّا قَلِيْلاً مِّنْهُمْ﴾ ''سوائے اُن میں سے ایک قلیل تعداد کے۔''

﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ ''تو جب دریا پار کر کے آگے بڑھے طالوت اور اُس کے ساتھی اہل ایمان''

واضح رہے کہ سب سے پہلی سکریننگ قبل ازیں ہو چکی تھی۔ ان میں سے جو قتال ہی کے منکر ہو گئے تھے وہ پہلے ہی الگ ہو چکے تھے۔ اب یہ دوسری چھلنی تھی۔ جو اُس میں سے نہیں نکل سکے وہ پانی پی کر بے سدھ ہو گئے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے غزوۂ اُحد میں رسول اللہﷺ کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینہ منورہ سے نکلے تھے اور پھر عین وقت پر تین سو افراد ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ تو جب طالوت اور اُن کے ان ساتھیوں نے جو ایمان پر ثابت قدم رہے تھے، دریا پار کر لیا.....

﴿قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ ''تو اُنہوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔''

جالوت (Goliath) بڑا قوی ہیکل اور گرانڈیل انسان تھا۔ زرہ بکتر میں اس کا پورا جسم اس طرح چھپا ہوا تھا کہ سوائے آنکھ کے سوراخ کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں تھا۔ اُس کی مبارزت کے جواب میں کوئی بھی مقابلے پر نہیں آ رہا تھا۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''تو کہا اُن لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ انہیں (ایک دن) اللہ سے ملاقات کرنی ہے، کہ کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی اللہ کے حکم سے۔''

سو تم آگے بڑھو، ہمت کرو، اپنی کم ہمتی کا ثبوت نہ دو۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد سے تمہیں فتح حاصل ہو جائے گی۔

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

آیت ۲۵۰ ﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ ''اور جب وہ مقابلے پر نکلے جالوت اور اس

کے لشکروں کے‘‘

بَرَزَ کے معنی ہیں ظاہر ہو جانا‘ آمنے سامنے آ جانا۔ اب دونوں لشکر میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آئے۔ اِدھر طالوت کا لشکر ہے اور اُدھر جالوت کا۔

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ ’’تو انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے ربّ! ہم پر صبر اُنڈیل دے‘‘

’’اَفْرَغَ‘‘ کا مفہوم ہے کسی برتن سے کسی کے اوپر پانی اس طرح گرا دینا کہ وہ برتن خالی ہو جائے۔ طالوت اور ان کے ساتھی اہل ایمان نے دشمن کے مدمقابل آنے پر دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کا فیضان فرما‘ صبر کی بارش فرما دے۔

﴿وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ ’’اور (میدانِ جنگ میں) ہمارے قدموں کو جما دے‘‘

﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ ’’اور ہماری مدد فرما ان کافروں کے مقابلے میں۔‘‘

یہ دعا گویا اہل ایمان کو تلقین کی جا رہی ہے کہ جب بدر کے موقع پر تمہارا کفار سے مقابلہ ہوگا تو تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے۔

آیت ۲۵۱ ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۖ﴾ ’’تو انہوں نے مار بھگایا اُن کو اللہ کے حکم سے۔‘‘

اہل ایمان نے اللہ کے اذن سے اور اللہ کی مشیت سے دشمنوں کو شکست دی۔

﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ ’’اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا‘‘

یہ داؤد وہی حضرت داؤد d ہیں جو جلیل القدر نبی اور بادشاہ ہوئے۔ ان کے بیٹے حضرت سلیمان d تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد ایک گڈریے تھے اور جنگل میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک گوپیا ہوتا تھا‘ جس کے اندر پتھر رکھ کر وہ اس کو گھما کر مارتے تھے۔ نشانہ اتنا صحیح تھا کہ اس سے وہ اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے جنگلی جانوروں کے جبڑے توڑ دیا کرتے تھے۔ جب طالوت اور جالوت کے لشکر آمنے سامنے تھے تو داؤد اتفاقاً وہاں آ نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ جالوت للکار رہا ہے کہ کوئی جو میرے مقابلہ میں آئے؟ لیکن ادھر سب کے سب سہمے کھڑے ہیں‘ کوئی آگے نہیں بڑھ رہا۔ یہ دیکھ کر اُن کی غیرت کو جوش آ گیا۔ انہوں نے طالوت سے اس کے مقابلے کی اجازت مانگی اور کہنے لگے کہ میں تو اپنے گوپیے سے شیروں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں‘ بھلا اس نامختون کی کیا حیثیت ہے‘ میں ابھی اس کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہوں۔ (واضح رہے کہ ختنہ حضرت ابراہیم d کی سنت ہے اور یہ ملتِ ابراہیمی میں ہمیشہ رائج رہا ہے۔ لیکن کفار اور مشرکین کے ہاں ختنہ کا رواج نہیں تھا۔ چنانچہ ’’نامختون‘‘ بنی اسرائیل کے ہاں سب سے بڑی گالی تھی۔) داؤدؑ نے سپہ سالار کی اجازت سے اپنا گوپیا اور چند پتھر

اٹھائے اور دیوہیکل جالوت کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جالوت نے ان کا مذاق اڑایا' لیکن انہوں نے اپنے گوپیے میں ایک پتھر رکھ کر ایسے گھما کر چھوڑا کہ وہ سیدھا آنکھ کے سوراخ سے پار ہو کر اس کے بھیجے کے اندر اتر گیا اور جالوت وہیں ڈھیر ہو گیا۔

﴿وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾ ''اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت عطا کی اور جو کچھ چاہا اسے سکھا دیا۔''

طالوت نے داؤدؑ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا' اس طرح وہ طالوت کے داماد ہو گئے۔ پھر طالوت نے انہی کو اپنا وارث بنایا اور یہ بادشاہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد d کو حکومت و سلطنت بھی عطا فرمائی اور حکمت و نبوت سے بھی نوازا۔ ان دونوں اعتبارات سے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو سرفراز فرمایا۔ یہ سب انعامات اس واقعے کے بعد حضرت داؤد d پر ہوئے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اللہ نے انہیں سکھایا جو کچھ کہ اللہ نے چاہا۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ ''اور اگر (اس طریقے سے) اللہ ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا''

زمین میں جب بھی فساد ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی شکل ایسی پیدا کرتا ہے کہ کسی اور گروہ کو سامنے لا کر مفسدوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین میں فساد ہی فساد پھیل گیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جنگوں کے ذریعہ سے فسادی گروہوں کا خاتمہ فرمایا ہے۔ ہر بڑا فرعون جو آتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مقابل کسی موسیٰ کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر سرکش اور فسادی کے لیے کوئی نہ کوئی علاج تجویز کیا ہوا ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''لیکن اللہ تعالیٰ تو تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''

آیت ۲۵۲ ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾ ''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپؐ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔''

یہ قول گویا حضرت جبرائیلؑ کی طرف منسوب ہو گا۔ یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپؐ کو سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔ یہ ایک بامقصد سلسلہ ہے۔

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ ''اور یقیناً (اے محمد ﷺ) آپؐ (اللہ کے) رسولوں میں سے ہیں۔''

آیت ۲۵۳ ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ''ان رسولوںؑ میں سے ہم نے بعض

کو بعض پر فضیلت دی ہے۔''

یہ ایک بہت اہم اصول بیان ہو رہا ہے۔ یہ بات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ ''تفریق بین الرسل'' کفر ہے' جبکہ ''تفضیل'' قرآن سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ چنانچہ جزوی فضیلتیں مختلف رسولوں کی ہو سکتی ہیں' البتہ کلی فضیلت تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔

﴿مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ ''ان میں سے وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام فرمایا''

یہ حضرت موسیٰ d کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔

﴿وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ ''اور بعض کے درجات (کسی اور اعتبار سے) بڑھا دیے۔''

﴿وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ﴾ ''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو بڑے کھلے معجزے دیے''

﴿وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ﴾ ''اور ان کی مدد فرمائی روح القدس (حضرت جبرائیل d) کے ساتھ۔''

﴿وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد آنے والے آپس میں نہ لڑتے جھگڑتے''

یعنی نہ تو یہودیوں کی آپس میں جنگیں ہوتیں' نہ یہودیوں اور نصرانیوں کی لڑائیاں ہوتیں' اور نہ ہی نصرانیوں کے فرقے ایک دوسرے سے لڑتے۔

﴿مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ﴾ ''اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح تعلیمات آ چکی تھیں''

﴿وَلٰـكِنِ اخۡتَلَفُوۡا﴾ ''لیکن انہوں نے اختلاف کیا''

﴿فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ ؕ﴾ ''پھر کوئی تو اُن میں سے ایمان لایا اور کوئی کفر پر اڑا رہا۔''

﴿وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۫﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔''

یعنی اگر اللہ تعالیٰ جبراً تکوینی طور پر ان پر لازم کر دیتا تو وہ اختلاف نہ کرتے اور آپس میں جنگ و جدال سے باز رہتے۔

﴿وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ۝﴾ ''لیکن اللہ تو کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس حکمت پر بنایا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی آزمائش ہے۔ چنانچہ آزمائش کے لیے اُس نے انسان کو آزادی دی ہے۔ تو جو شخص غلط راستے پر جانا چاہتا ہے اسے بھی آزادی ہے اور جو صحیح راستے پر آنا چاہے اسے بھی آزادی ہے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۲۸ تا ۳۰

﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ۝ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَھَا وَبَیْنَہٗٓ اَمَدًا ۢ بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

ص د ر

صَدَرَ (ن) صَدْرًا : (۱) سینے میں درد ہونا۔ (۲) واپس ہونا' پھرنا۔ ﴿یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ﴾ (الزلزال:٦) ''جس دن واپس ہوں گے لوگ گروہ در گروہ۔''

صَدْرٌ ج صُدُوْرٌ : سینہ۔ ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۙ﴾ (طٰہٰ) ''اے میرے ربّ! تو کھول دے میرے لیے میرے سینے کو۔''

اَصْدَرَ (افعال) اِصْدَارًا : واپس کرنا' واپس لے جانا' یعنی پھیرنا۔ ﴿لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَاءُ ؕ﴾ (القصص:۲۳) ''ہم نہیں پلاتے یہاں تک کہ واپس لے جائیں چرواہے۔''

ء م د

اَمِدَ (س) اَمَدًا :غصہ ہونا (کسی چیز کے انجام کے پیشِ نظر)۔

اَمَدٌ :کسی چیز کی انتہا' مدت ۔﴿اَمْ یَجْعَلُ لَہٗ رَبِّیْ اَمَدًا ۝﴾ (الجن) ''یا مقرر کرے گا اس کے لیے میرا ربّ ایک مدت ۔''

ترکیب :''مِنَ اللّٰہِ'' سے مراد ہے ''مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ'' ۔''اِلَّا'' کا استثناء ''لَا یَتَّخِذْ'' کے لیے ہے ۔''مِنْ خَیْرٍ'' اور ''مِنْ سُوْءٍ'' کا ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے ۔''مُّحْضَرًا'' حال ہے ۔''تَوَدُّ'' کا فاعل اس میں ''ھِیَ'' کی ضمیر ہے جو ''کُلُّ نَفْسٍ'' کے لیے ہے ۔''اَمَدًا'' بَعِیْدًا'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور ''اَنَّ'' کا اسم ہونے کی وجہ سے منصوب ہے ۔

ترجمہ:

لَا یَتَّخِذِ :چاہیے کہ مت بنائیں	الْمُؤْمِنُوْنَ :مؤمن لوگ
الْکٰفِرِیْنَ :کافروں کو	اَوْلِیَآءَ :کارساز
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ :مؤمنوں کے علاوہ	وَمَنْ یَّفْعَلْ :اور جو کرے گا
ذٰلِکَ :یہ	فَلَیْسَ :تو وہ نہیں ہے
مِنَ اللّٰہِ :اللہ (کے دین) سے	فِیْ شَیْءٍ :کسی چیز میں
اِلَّا :سوائے اس کے	اَنْ :کہ
تَتَّقُوْا :تم لوگ بچو	مِنْھُمْ :ان سے
تُقٰۃً :جیسے بچنا چاہیے	وَیُحَذِّرُ :اور محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے
کُمُ :تم لوگوں کو	اللّٰہُ :اللہ
نَفْسَہٗ :اس کے نفس (یعنی غضب) سے	وَاِلَی اللّٰہِ :اور اللہ کی طرف ہی
الْمَصِیْرُ :لوٹنا ہے	قُلْ :آپ ؐ کہیے!
اِنْ :اگر	تُخْفُوْا :تم لوگ چھپاؤ
مَا :اس کو جو	فِیْ صُدُوْرِکُمْ :تمہارے سینوں میں ہے
اَوْ : یا	تُبْدُوْہُ :تم لوگ ظاہر کرو اس کو
یَعْلَمْہُ :جانتا ہے اس کو	اللّٰہُ :اللہ
وَیَعْلَمُ :اور وہ جانتا ہے	مَا :اس کو جو
فِی السَّمٰوٰتِ :آسمانوں میں ہے	وَمَا :اور اس کو جو

فِی الْاَرْضِ :زمین میں ہے	وَاللّٰہُ :اوراللہ
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ :ہرچیز پر	قَدِیْرٌ :قادر ہے
یَوْمَ :جس دن	تَجِدُ :پائے گی
کُلُّ نَفْسٍ :ہرایک جان	مَّا :اس کوجو
عَمِلَتْ :اس نےعمل کیا	مِنْ خَیْرٍ :کسی بھی بھلائی میں سے
مُّحْضَرًا :حاضرکیاہوا	وَّمَا :اوراس کوجو
عَمِلَتْ :اس نےعمل کیا	مِنْ سُوْءٍ :کسی بھی برائی میں سے
تَوَدُّ :وہ چاہےگی	لَوْ :کاش
اَنَّ :کہ	بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗ : اس (نفس) کے اور اس (برائی) کے مابین
اَمَدًا بَعِیْدًا :انتہائی دوری ہوتی	وَیُحَذِّرُ :اورمحتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے
کُمُ :تم لوگوں کو	اللّٰہُ :اللہ
نَفْسَهٗ :اپنےنفس (یعنی غضب) سے	وَاللّٰہُ:اوراللہ
رَؤُوْفٌ :بہت نرمی کرنے والا ہے	بِالْعِبَادِ :بندوں سے

نوٹ (۱) : آیات زیرمطالعہ کےعلاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پرغیرمسلموں سےتعلقات کی ممانعت آئی ہے۔اس حکم کا ایک استثناء آیات زیرمطالعہ میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا کےالفاظ میں آیا ہےاور دوسرا استثناء سورۃ الممتحنۃ کی آیت ۸ میں ہے۔اس مسئلہ پرمفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

باہمی تعلقات میں ایک درجہ قلبی تعلق کا ہے' جس میں یہ چیزیں آتی ہیں: (i) مودّت: یعنی ایک دوسرے کے دل میں باہمی چاہت اورمحبت کا رشتہ استوار کرنا(المجادلۃ:۲۲)۔(ii) دوسرے کواپنا ولیجہ یعنی دل کا بھیدی اور رازدار بنانا(التوبۃ:۱۶)۔(iii) دوسرے کواپنا ولی یعنی حمایتی اور کارساز بنانا اور ضرورت ہوتواس کااحسان لینے میں تکلف نہ کرنا (آیت زیرمطالعہ)۔

قلبی تعلق کے اس درجہ کے لیے ''موالات'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اوراس درجہ کے تعلقات مؤمنوں کےعلاوہ کسی دوسرے کےساتھ جائزنہیں ہیں۔

تعلقات کا دوسرادرجہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کےساتھ نیک سلوک کیا جائے'ان کاحق ادا کیا جائے اور حالات اجازت دیں تو ان پراحسان کیا جائے۔اس کے لیے ''مواسات'' کی اصطلاح ہے۔اس درجہ کےتعلقات مسلمانوں اورذمی کافر کےعلاوہ ایسے کافر کےساتھ بھی جائز ہیں جس کی قوم مسلمانوں کے

ساتھ حالتِ جنگ میں نہ ہو۔ البتہ حربی کافر کے ساتھ اس درجہ کے تعلقات بھی جائز نہیں ہیں۔(المُمتحنة:٨)

تعلقات کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے رسمی میل ملاقات اور راہ و رسم ہو اُن کے ساتھ ہنس مکھ ہو اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اس کے لیے ''مدارات'' کی اصطلاح ہے اور یہ تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ اور آیت زیر مطالعہ میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا سے یہی درجہ مراد ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ کسی کے ساتھ تجارت' ملازمت' اجرت' صنعت یا حرفت کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے لیے ''معاملات'' کی اصطلاح ہے اور یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ رسول کریمﷺ اور صحابہ کرام j کا عمل اس بات کی سند ہے۔ البتہ حربی کافر کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

آیات ۳۱ تا ۳۴

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَـکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝﴾

ترکیب :حرف شرط ''اِنْ'' ماضی (کُنْتُمْ) پر آیا ہے اس لیے اس کا عمل ظاہر نہیں ہوا' لیکن وہ محلاً مجزوم ہے۔ جوابِ شرط میں فعل امر ''اِتَّبِعُوْا'' آیا ہے جو کہ از خود مجزوم ہوتا ہے۔ ''یُحْبِبْ'' اور ''یَغْفِرْ'' جواب شرط نہیں ہیں' بلکہ ''اِتَّبِعُوْا'' کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ ''تَوَلَّوْا'' کے دو امکانات ہیں۔ یہ ماضی میں جمع مذکر غائب کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور مضارع میں جمع مذکر مخاطب ''تَتَوَلَّوْنَ'' بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی پہلی تا حذف ہوئی اور شرط ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا تو ''تَوَلَّوْا'' آیا۔ پیچھے فعل امر مخاطب ''اَطِیْعُوْا'' آیا ہے اس لیے اس کو جمع مذکر مخاطب ماننا بہتر ہے۔ ''اٰدَمَ''۔ ''نُوْحًا'' اور ''اٰلَ'' مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں' جبکہ ''اِبْرٰهِیْمَ'' اور ''عِمْرٰنَ'' مجرور ہیں' کیونکہ یہ ''اٰلَ'' کا مضاف الیہ ہیں۔ ''ذُرِّیَّةً'' حال ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہیے!	اِنْ :اگر
کُنْتُمْ :تم لوگ ہو کہ	تُحِبُّوْنَ :تم محبت کرتے ہو
اللّٰهَ :اللہ سے	فَاتَّبِعُوْنِیْ :تو پھر پیروی کرو میری
یُحْبِبْکُمُ :تو محبت کرے گا تم سے	اللّٰهُ :اللہ

وَیَغۡفِرۡ : اور وہ بخش دے گا
لَـکُمۡ : تمہارے لیے
ذُنُوۡبَکُمۡ : تمہارے گناہوں کو
وَاللّٰہُ : اور اللہ
غَفُوۡرٌ : بے انتہا بخشنے والا ہے
رَّحِیۡمٌ : ہمیشہ رحم کرنے والا ہے
قُلۡ : آپؐ کہیے
اَطِیۡعُوا : تم لوگ اطاعت کرو
اللّٰہَ : اللہ کی
وَالرَّسُوۡلَ : اور رسولؐ کی
فَاِنۡ : پھر اگر
تَوَلَّوۡا : تم لوگ روگردانی کرو گے
فَاِنَّ : تو یقیناً
اللّٰہَ : اللہ
لاَ یُحِبُّ : محبت نہیں کرتا
الۡکٰفِرِیۡنَ : انکار کرنے والوں سے
اِنَّ : یقیناً
اللّٰہَ : اللہ نے
اصۡطَفٰۤی : چن لیا
اٰدَمَ : آدمؑ کو
وَنُوۡحًا : اور نوحؑ کو
وَّاٰلَ اِبۡرٰھِیۡمَ : اور ابراہیمؑ کے پیروکاروں کو
وَاٰلَ عِمۡرٰنَ : اور عمران کے پیروکاروں کو
عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ : تمام جہان (والوں) پر
ذُرِّیَّۃً : اولاد ہوتے ہوئے
بَعۡضُھَا مِنۡۢ بَعۡضٍ : ان کا کوئی کسی کی
وَاللّٰہُ : اور اللہ
سَمِیۡعٌ : سننے والا ہے
عَلِیۡمٌ : جاننے والا ہے

نوٹ : البقرۃ:۴۹ کے نوٹ:۱ میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ کسی نبی کی پیروی کرنے والے اس کی آل میں ہیں، خواہ نبی سے ان کا نسلی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ غالباً اسی لیے آیت زیر مطالعہ میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ آل ابراہیمؑ اور آل عمران میں سے جن کو اللہ نے چنا وہ ان کی نسل سے تھے۔

آیات ۳۵، ۳۶

﴿اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰی ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ ؕ وَلَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی ۚ وَاِنِّیۡ سَمَّیۡتُهَا مَرۡیَمَ وَاِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۳۶﴾﴾

و ض ع

وَضَعَ (ف) وَضۡعًا : (۱) تیز چلنا، دوڑنا۔ (۲) کسی چیز کو اتار کر نیچے رکھنا۔ (i) اُتارنا۔ (ii) رکھنا۔ (iii) بچہ جننا۔ ﴿وَوَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ﴾ (الم نشرح) ''اور ہم نے اتارا آپؐ سے آپؐ

کا بوجھ۔'' ﴿حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا﴾ (محمد:٤) ''یہاں تک کہ جنگ رکھ دے اپنے بوجھ یعنی ہتھیار۔''

مَوْضُوْعٌ (اسم المفعول) : رکھا ہوا۔ ﴿وَاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝﴾ (الغاشية) ''اور آبخورے رکھے ہوئے۔''

مَوْضَعٌ ج مَوَاضِعُ (مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف) : رکھنے کی جگہ' مقام۔ ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (النساء:٤٦) ''اور وہ لوگ پھیر دیتے ہیں باتوں کو ان کی جگہوں سے''۔

اَوْضَعَ (افعال) اِيْضَاعًا : تیز چلانا' دوڑانا۔ ﴿لَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ﴾ (التوبة:٤٧) ''اور وہ لوگ ضرور دوڑاتے تم لوگوں کے بیچ میں۔''

ترکیب : ''اِمْرَاَتُ'' لمبی تا سے لکھا گیا ہے' یہ قرآن مجید کا مخصوص املاء ہے۔ ''اِمْرَاَتُ'' کا مضاف الیہ ''عِمْرٰنَ'' ہے۔ ''نَذَرْتُ'' کا مفعول ''مَا'' ہے۔ ''مُحَرَّرًا'' اسم المفعول ہے اور حال ہے۔ ''اِنِّیْ'' میں ہر جگہ یائے متکلم کی ضمیریں ''اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ'' کے لیے ہیں' درمیان میں ''وَاللّٰهُ اَعْلَمُ'' سے ''كَالْاُنْثٰی'' تک جملہ معترضہ ہے۔ ''اُنْثٰی'' حال ہے۔

ترجمہ:

اِذْ : جب	قَالَتِ : کہا
امْرَاَتُ عِمْرٰنَ : عمران کی بیوی نے	رَبِّ : اے میرے ربّ
اِنِّیْ : بے شک میں نے	نَذَرْتُ : منت مانی
لَکَ تیرے لیے	مَا : اس کی جو
فِیْ بَطْنِیْ : میرے پیٹ میں ہے	مُحَرَّرًا : آزاد کیا ہوا ہوتے ہوئے
فَتَقَبَّلْ : پس تو قبول فرما	مِنِّیْ : مجھ سے
اِنَّکَ لَنْتَ : بے شک تو ہی	السَّمِیْعُ : سننے والا ہے
الْعَلِیْمُ : جاننے والا ہے	فَلَمَّا : پھر جب
وَضَعَتْهَا : اس نے جنا اس کو	قَالَتْ : تو اس نے کہا
رَبِّ : اے میرے ربّ	اِنِّیْ : بے شک میں نے
وَضَعْتُهَآ : جنا اُس کو	اُنْثٰی : مؤنث
وَاللّٰهُ : اور اللہ	اَعْلَمُ : زیادہ جانتا ہے
بِمَا : اس کو جو	وَضَعَتْ : اس نے جنا

وَلَـيْسَ الذَّكَرُ: اور نہیں ہے مذکر
كَالْاُنْثٰى : مؤنث کی مانند
وَاِنِّيْ : اور بے شک میں نے
سَمَّيْتُهَا : نام رکھا اس کا
مَرْيَمَ : مریم
وَاِنِّيْ : اور بے شک میں
اُعِيْذُهَا : پناہ میں دیتی ہوں اس کو
بِكَ تیری
وَذُرِّيَّتَهَا: اور اس کی اولاد کو
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ : دھتکارے ہوئے شیطان سے

آیات ۳۷‘۳۸

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْبَتَهَا نَـبَاتًا حَسَنًاۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّاؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًاۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَاؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةًۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ۝﴾

ک ف ل

كَفَلَ (ن ـض) كَفْلًا : کسی شخص یا مال کا ضامن ہونا۔

كَفَالَةً : کسی کی ضروریات کا ضامن ہونا‘ رکھوالی کرنا‘ کفالت کرنا۔ ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ﴾ (القصص:۱۲) ’’کیا میں پتا بتاؤں تم لوگوں کو ایک ایسے گھر والوں کا جو پال پوس دیں گے اس کو تمہارے لیے۔‘‘

كَفِيْلٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) : (۱) ضمانت دینے والا یعنی ضامن۔ (۲) رکھوالی کرنے والا یعنی رکھوالا‘ نگران۔ ﴿وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًاؕ﴾ (النحل:۹۱) ’’اور تم لوگ بنا چکے ہو اللہ کو اپنا ضامن۔‘‘

كِفْلٌ (اسم ذات) : (۱) ضمانت۔ (۲) حصہ (اچھے یا برے نتیجے میں)۔ ﴿وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾ (النساء:۸۵) ’’اور جو سفارش کرتا ہے‘ کوئی بری سفارش‘ تو ہو گا اس کے لیے ایک حصہ اس میں سے۔‘‘

ذَا الْكِفْلِ : ایک نبی کا نام ہے۔ ﴿وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِؕ﴾ (الانبیاء:۸۵) ’’اور اسمٰعیلؑ کو اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو۔‘‘

اَكْفَلَ (افعال) اِكْفَالًا : کسی کو کسی کی کفالت میں دینا۔

اَكْفِلْ (فعل امر): تو کفالت میں دے۔ ﴿فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا﴾ (ص:۲۳) ’’پھر اس نے کہا تو میری

کفالت میں دے اس کو۔''

کَفَّلَ (تفعیل) تَکْفِیْلًا: کسی کو کفیل بنانا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''تَقَبَّلَهَا'' اور ''اَنْبَتَهَا'' میں ضمیر مفعولی مریم کے لیے ہے اور ان کا فاعل ''رَبُّهَا'' ہے۔ ''بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ'' اور ''نَبَاتًا حَسَنًا'' ثلاثی مجرد سے مفعول مطلق آئے ہیں، جبکہ فعل علی الترتیب بابِ تفعّل اور افعال سے آئے ہیں۔ (آل عمران: ۳۷، نوٹ: ۱) ''کَفَّلَ'' کا فاعل اس میں ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو ربّ کے لیے ہے۔ ''هَا'' مفعول اور ''زَکَرِیَّا'' مفعول ثانی ہے۔ ''زَکَرِیَّا'' مبنی کی طرح استعمال ہوتا ہے، اس لیے اس کی رفع، نصب اور جر ظاہر نہیں ہوتی۔ ''کُلَّمَا'' حرفِ شرط ہے۔ ''دَخَلَ'' کا فاعل ''زَکَرِیَّا'' ہے۔ ''اَلْمِحْرَابَ'' ظرف ہے۔ ''وَجَدَ عِنْدَهَا'' جواب شرط ہے۔

ترجمہ:

فَتَقَبَّلَهَا: تو قبول کیا اس کو	رَبُّهَا: اس کے ربّ نے
بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ: خوبصورت قبول کرنا	وَّاَنْبَتَهَا: اور اس نے نشوونما کی اس کی
نَبَاتًا حَسَنًا: خوبصورت نشوونما کرنا	وَّکَفَّلَهَا: اور اس نے کفیل بنایا ان کا
زَکَرِیَّا: زکریّا کو	کُلَّمَا: جب کبھی
دَخَلَ: داخل ہوتے	عَلَیْهَا: ان پر
زَکَرِیَّا: زکریاؑ	الْمِحْرَابَ: محراب میں
وَجَدَ: تو وہ پاتے	عِنْدَهَا: ان کے پاس
رِزْقًا: کچھ رزق	قَالَ: تو وہ کہتے
یٰمَرْیَمُ: اے مریم	اَنّٰی: کہاں سے
لَکِ: تیرے لیے	هٰذَا: یہ ہے
قَالَتْ: تو وہ کہتیں	هُوَ: یہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ: اللہ کے پاس سے ہے	اِنَّ اللّٰهَ: بے شک اللہ
یَرْزُقُ: رزق دیتا ہے	مَنْ: اس کو جس کو
یَّشَآءُ: وہ چاہتا ہے	بِغَیْرِ حِسَابٍ: کسی حساب کے بغیر
هُنَالِکَ: وہیں	دَعَا: پکارا
زَکَرِیَّا: زکریاؑ نے	رَبَّهٗ: اپنے ربّ کو
قَالَ: انہوں نے کہا	رَبِّ: اے میرے ربّ
هَبْ: تو عطا کر	لِیْ: میرے لیے

مِنۡ لَّدُنۡکَ اپنے خزانے سے	ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً :ایک پاکیزہ اولاد
اِنَّکَ بے شک تو	سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ :دعا کا سننے والا ہے

آیات ۳۹، ۴۰

﴿فَنَادَتۡہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَہُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیۡ فِی الۡمِحۡرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحۡیٰی مُصَدِّقًۢا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّقَدۡ بَلَغَنِیَ الۡکِبَرُ وَامۡرَاَتِیۡ عَاقِرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ﴾

ع ق ر

عَقَرَ (ض) عَقۡرًا :(۱) درخت کو جڑ سے کاٹنا۔(۲) چوپائے کی ٹانگیں کاٹنا۔(۳) اپنی نسل کاٹنا یعنی بانجھ ہونا۔﴿فَعَقَرُوا النَّاقَۃَ﴾(الاعراف:۷۷) ''پھر ان لوگوں نے ٹانگیں کاٹیں اونٹنی کی۔''

عَاقِرٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت): کاٹنے والا۔ بانجھ (یہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے)۔

آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''واو'' حالیہ ہے اور یہ ''ھُوَ'' کا حال ہے۔ جبکہ ''قَائِمٌ'' کا حال ''یُصَلِّیۡ'' ہے۔ ''مُصَدِّقًا' سَیِّدًا' حَصُوۡرًا' نَبِیًّا'' یہ سب ''یَحۡیٰی'' کے حال ہیں۔ ''یَکُوۡنُ'' کَانَ تامّہ ہے۔

ترجمہ:

فَنَادَتۡہُ :تو آواز دی انؑ کو	الۡمَلٰٓئِکَۃُ :فرشتوں نے
وَ :اس حال میں کہ	ھُوَ :وہ
قَآئِمٌ :کھڑے تھے	یُّصَلِّیۡ :نماز پڑھتے ہوئے
فِی الۡمِحۡرَابِ :محراب میں	اَنَّ :کہ
اللّٰہَ :اللہ	یُبَشِّرُکَ بشارت دیتا ہے آپؑ کو
بِیَحۡیٰی :یحییٰؑ کی	مُصَدِّقًا :تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے
بِکَلِمَۃٍ :ایک فرمان کی	مِّنَ اللّٰہِ :اللہ (کی طرف) سے
وَسَیِّدًا :اور سردار ہوتے ہوئے	وَّحَصُوۡرًا :اور عورتوں سے الگ ہوتے ہوئے
وَّنَبِیًّا :اور نبی ہوتے ہوئے	مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ :صالحین میں سے
قَالَ :انہوں نے کہا	رَبِّ :اے میرے ربّ
اَنّٰی :کہاں سے	یَکُوۡنُ :ہوگا

لِیْ : میرے لیے	غُلٰمٌ : کوئی لڑکا
وَّ : اس حال میں کہ	قَدْ بَلَغَنِیَ : پہنچ چکا ہے مجھ کو
الْکِبَرُ : بڑھاپا	وَامْرَاَتِیْ : اور میری عورت
عَاقِرٌ : بانجھ ہے	قَالَ : (فرشتے نے) کہا
کَذٰلِکَ اس طرح (ہی ہے)	اللّٰہُ : اللہ
یَفْعَلُ : کرتا ہے	مَا : وہ جو
یَشَآءُ : وہ چاہتا ہے	

نوٹ : ''بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ'' سے مراد حضرت عیسیٰ d ہیں' جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔

آیات ۴۱ تا ۴۳

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ ۩ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىکِ وَطَهَّرَکِ وَاصْطَفٰىکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۩﴾

ر م ز

رَمَزَ (ن۔ض) رَمْزًا : اشاروں میں بات سمجھانا' اشارہ کرنا۔

رَمْزٌ (اسم ذات بھی ہے) : اشارہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ع ش و

عَشَا (ن) عَشْوًا : (۱) آنکھ میں موتیا اُترنے کی وجہ سے دھندلا نظر آنا۔ (۲) کسی طرف سے آنکھ بند کرنا' جی چرانا۔ ﴿وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ﴾ (الزخرف:۳۶) ''اور جو آنکھ چراتا ہے رحمٰن کی یاد سے۔''

عِشَاءٌ : رات کی ابتدائی تاریکی۔ ﴿وَجَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْکُوْنَ﴾ (یوسف) ''اور وہ آئے اپنے والد کے پاس مغرب کے بعد روتے ہوئے۔''

عَشِیَّةٌ ج عَشِیٌّ : شام۔ ﴿لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ۧ﴾ (النّٰزعٰت) ''وہ لوگ نہیں ٹھہرے مگر ایک شام یا اس کے دن چڑھے (وقت کا ایک حصہ)۔''

ترکیب : ''اٰیَتُکَ'' مبتدأ ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ''اَلَّا تُکَلِّمَ''، ''اٰیَةُ'' کا بدل ہے۔

''اَلَّا'' دراصل ''اَنْ لَا'' ہے اور ''اَنْ'' نے ''تُکَلِّمَ'' کو منصوب کیا ہے۔ اس کا مفعول ''النَّاسَ'' ہے۔ ''ثَلٰثَةَ'' ظرف اور ''رَمْزًا'' مستثنیٰ منقطع یا متصل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ ''وَاذْکُرْ'' کا مفعول مطلق ''ذِکْرًا'' محذوف ہے اور ''کَثِیْرًا'' اس کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

ترجمہ:

قَالَ : (زکریاؑ نے) کہا	رَبِّ : اے میرے ربّ
اجْعَلْ : تو بنا	لِّیْ : میرے لیے
اٰیَةً : ایک نشانی	قَالَ : (اللہ تعالیٰ نے) کہا
اٰیَتُکَ تیری نشانی ہے	اَلَّا تُکَلِّمَ : کہ تو کلام نہیں کرے گا
النَّاسَ : لوگوں سے	ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ : تین دن
اِلَّا : مگر	رَمْزًا : اشارے سے
وَاذْکُرْ : اور تو یاد کر	رَّبَّکَ اپنے ربّ کو
کَثِیْرًا : کثرت سے	وَّسَبِّحْ : اور تو تسبیح کر
بِالْعَشِیِّ : شاموں کو	وَالْاِبْکَارِ : اور صبح سویرے
وَاِذْ : اور جب	قَالَتِ : کہا
الْمَلٰٓئِکَةُ : فرشتوں نے	یٰمَرْیَمُ : اے مریم
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ نے	اصْطَفٰکِ چن لیا آپ کو
وَطَهَّرَکِ اور اس نے پاک کیا آپ کو	وَاصْطَفٰکِ اور اس نے چنا آپ کو
عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ : تمام جہانوں کی عورتوں پر	یٰمَرْیَمُ : اے مریم
اقْنُتِیْ : آپ فرماں برداری کریں	لِرَبِّکِ اپنے ربّ کی
وَاسْجُدِیْ : اور آپ سجدہ کریں	وَارْکَعِیْ : اور آپ رکوع کریں
مَعَ الرّٰکِعِیْنَ : رکوع کرنے والوں کے ساتھ	

نوٹ : لفظ ''رَمْزٌ'' میں بنیادی مفہوم ہے ہونٹ کی حرکت سے اشارہ کر کے بات سمجھانا۔ جبکہ اَبرو اور آنکھ سے اشارہ کر کے بات سمجھانے کو ''غَمْزٌ'' کہتے ہیں' اور یہ لفظ باب تفاعل سے سورۃ **المُطفّفین** کی آیت ۳۰ میں آیا ہے۔ oo

آیات ۴۴ تا ۴۶

﴿ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ۚ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَہُمۡ اَیُّہُمۡ یَکۡفُلُ مَرۡیَمَ ۪ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ ٭ اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ وَجِیۡہًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَکَہۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾

و ح ی

وَحَی (ض) وَحۡیًا: پوشیدہ پیغام بھیجنا' الہام کرنا۔

وَحۡیٌ (اسم ذات): پوشیدہ پیغام' الہام' وحی۔ ﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا﴾ (الشوریٰ:۵۱) ''اور نہیں ہے کسی بشر کے لیے کہ کلام کرے اس سے اللہ مگر الہام سے یا پردے کے پیچھے سے' یا وہ بھیجے ایک پیغامبر (یعنی فرشتہ)۔''

اَوۡحٰی (افعال) اِیۡحَاءً: پوشیدہ پیغام بھیجنا' الہام کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔ (یہ ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہے لیکن قرآن مجید میں افعال ثلاثی مجرد سے نہیں بلکہ بابِ افعال سے آئے ہیں)۔

ک ھ ل

کَھَلَ (ف) کُھُوۡلًا: ادھیڑ عمر کا ہونا۔

کَھۡلٌ: ادھیڑ عمری کا زمانہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''ذٰلِکَ'' مبتدأ ہے' اس کی خبر ''اَنۡبَاءٌ'' محذوف ہے۔ ''مِنۡ اَنۡبَاءِ الۡغَیۡبِ'' قائم مقام خبر ہے۔ ''نُوۡحِیۡہِ'' جملہ فعلیہ ہے اور ''ذٰلِکَ'' کی خبر ثانی ہے۔ ''اِلَیۡکَ'' متعلق خبر ہے۔ ''اِسۡمُہُ'' مبتدأ ہے اور ''اَلۡمَسِیۡحُ'' اس کی خبر ہے' جبکہ ''عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ'' بدل ہے ''اَلۡمَسِیۡحُ'' کا۔ ''وَجِیۡہًا'' اور ''کَھۡلًا'' حال ہیں۔

ترجمہ:

ذٰلِکَ: یہ	مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ: غیب کی خبروں میں سے ہے
نُوۡحِیۡہِ: ہم وحی کرتے ہیں اس کو	اِلَیۡکَ: آپ ؐ کی طرف
وَمَا کُنۡتَ: اور آپ ؐ نہیں تھے	لَدَیۡہِمۡ: ان کے پاس
اِذۡ: جب	یُلۡقُوۡنَ: وہ ڈالتے تھے
اَقۡلَامَہُمۡ: اپنے قلم	اَیُّہُمۡ: (کہ) ان میں سے کون

يَكْفُلُ : کفالت کرے گا
مَرْيَمَ : مریم کی
وَمَا كُنْتَ : اور آپ ؐ نہیں تھے
لَدَيْهِمْ : ان کے پاس
اِذْ : جب
يَخْتَصِمُوْنَ : وہ لوگ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے
اِذْ قَالَتِ : جب کہا
الْمَلٰٓئِكَةُ : فرشتوں نے
يٰمَرْيَمُ : اے مریم
اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ
يُبَشِّرُكَ : بشارت دیتا ہے آپ کو
بِكَلِمَةٍ : ایک فرمان کی
مِّنْهُ : اپنی طرف سے
اسْمُهُ : اس کا نام
الْمَسِيْحُ : مسیحؑ ہے
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ : جو عیسیٰ ابن مریم ہیں
وَجِيْهًا : بلند رتبہ ہوں گے
فِي الدُّنْيَا : دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ : اور آخرت میں
وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ : اور (وہ ہوں گے) مقربین میں سے
وَيُكَلِّمُ : اور وہ کلام کریں گے
النَّاسَ : لوگوں سے
فِي الْمَهْدِ : گہوارے میں
وَكَهْلًا : اور ادھیڑ عمر ہوتے ہوئے
وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ : اور (وہ ہوں گے) صالحین میں سے

نوٹ : یہاں حضرت عیسیٰ d کے دو معجزوں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ وہ گہوارے میں لوگوں سے کلام کریں گے۔ دوسرا یہ کہ ادھیڑ عمری کی حالت میں کلام کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ دودھ پیتے بچے کا کلام کرنا تو معجزہ ہے، لیکن ادھیڑ عمری میں تو ہر شخص کلام کرتا ہے۔ اس کو معجزے کے طور پر بیان کرنے کا کیا مطلب ہے؟

یہ بات سب مانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق پھانسی دیے جانے کے وقت اور اسلامی عقیدے کے مطابق آسمان پر اٹھائے جانے کے وقت حضرت عیسیٰؑ کی عمر ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان تھی۔ اس طرح وہ ادھیڑ عمر کو پہنچے ہی نہیں۔ اب یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں اور ادھیڑ عمر کو پہنچیں۔ اس لیے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمری کا کلام بھی معجزہ ہوگا۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

آیات ۴۷، ۴۸

﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا

یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۴۷﴾ وَیُعَلِّمُہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَالتَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ﴿ۚ۴۸﴾

ترکیب : ''یُعَلِّمُہٗ'' کا فاعل اس میں ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے' جبکہ ضمیر مفعولی ''ہٗ'' حضرت عیسیٰؑ کے لیے ہے اور یہ ''یُعَلِّمُ'' کا مفعول اوّل ہے۔ ''اَلۡکِتٰبَ'' سے ''وَالۡاِنۡجِیۡلَ'' تک مفعول ثانی ہیں۔

ترجمہ:

قَالَتۡ : (بی بی مریم نے) کہا	رَبِّ : اے میرے ربّ
اَنّٰی : کہاں سے	یَکُوۡنُ : ہوگا
لِیۡ : میرے لیے	وَلَدٌ : کوئی لڑکا
وَّ : اس حال میں کہ	لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ : چھوا ہی نہیں مجھ کو
بَشَرٌ : کسی بشر نے	قَالَ : (فرشتے نے) کہا
کَذٰلِکِ اسی طرح ہی ہے	اللّٰہُ : اللہ
یَخۡلُقُ : پیدا کرتا ہے	مَا : اس کو جس کو
یَشَآءُ : وہ چاہتا ہے	اِذَا : جب کبھی
قَضٰٓی : وہ فیصلہ کرتا ہے	اَمۡرًا : کسی کام کا
فَاِنَّمَا : تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	یَقُوۡلُ : وہ کہتا ہے
لَہٗ : اس سے	کُنۡ : تو ہو جا
فَیَکُوۡنُ : پس وہ ہو جاتا ہے	وَیُعَلِّمُہُ : اور وہ علم دے گا انؑ کو
الۡکِتٰبَ : کتاب کا	وَالۡحِکۡمَۃَ : اور حکمت کا
وَالتَّوۡرٰىۃَ : اور تورات کا	وَالۡاِنۡجِیۡلَ : اور انجیل کا

نوٹ : ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کا ہم لوگوں کے ذہن میں تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی حکم دیتا ہے تو وہ پلک جھپکتے ہی فوراً ہو جاتا ہے' جبکہ ''فَیَکُوۡنُ'' کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب بس اتنا ہے کہ وہ ہو جاتا ہے' خواہ فوری طور پر ہو یا کچھ وقت لگے۔ اب نوٹ کر لیں کہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ عالمِ امر میں اس کے احکام کی تعمیل فوری ہوتی ہے' جبکہ عالمِ خلق میں تدریج کا اصول کارفرما ہے اور یہاں وقت لگتا ہے۔ مثال کے طور پر کسان جب زمین میں بیج ڈالتا ہے تو کچھ بیج نہیں پھوٹتے' کیونکہ انہیں حکم نہیں ملا۔ یہ وہ بیج ہیں جو ضائع ہو گئے۔ لیکن جن بیجوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جاتا ہے کہ ''کُنۡ''، یعنی تو

درخت ہو جا‘ تو ان کے اندر اس کیمیائی تبدیلی کا عمل فوری طور پر شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں بیج پھوٹتا ہے۔ یہ عالمِ امر ہے اور یہاں حکم کی تعمیل فوری ہے۔ لیکن کیمیائی تبدیلی کے نتیجے میں بیج کا پھوٹنا‘ اکھوے کا نکلنا‘ پودا بننا‘ پھر درخت بننا اور پھل آنا‘ یہ سب عالمِ خلق ہے۔ اس میں وقت لگتا ہے اور یہاں تدریج کا اصول کارفرما ہے۔

نوٹ (۲): حضرت عیسیٰ d کو تورات اور انجیل کی تعلیم دینے کا مطلب تو واضح ہے۔ لیکن یہاں ’’الکتٰب‘‘ اور ’’الحکمۃ‘‘ کی تعلیم دینے سے کیا مراد ہے‘ اس ضمن میں آراء مختلف ہیں۔ میرا ذہن شیخ الہندؒ کی رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ کتاب وحکمت سے مراد قرآن وسنت ہے‘ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور قرآن وسنت کے مطابق احکام دیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ انہیں قرآن وسنت کی تعلیم بھی دی جائے۔

آیت ۴۹

﴿وَرَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۙ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۙ﴾

ط ی ن

طَانَ (ض) طَیْنًا :گارے سے دیوار لیپنا۔

طِیْنٌ (اسم ذات) :گارا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ھـ ی ء

ھَاءَ (ض) ھَیْئَۃً :خوش شکل ہونا۔

ھَیْئَۃٌ (اسم ذات بھی ہے) :شکل‘ حلیہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ھَیَّءَ (تفعیل) تَھْیِئَۃً :کسی کو شکل دینا‘ یعنی کسی کام کا سامان مہیا کرنا‘ اسباب پیدا کرنا۔ ﴿وَیُھَیِّئْ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا ۝﴾ (الکھف) ’’اور وہ اسباب پیدا کرے گا تمہارے لیے تمہارے کام میں آسانی کے۔‘‘

ھَیِّئْ (فعل امر) :تو سامان فراہم کر‘ تو اسباب پیدا کر۔ ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝﴾ (الکھف) ’’اے ہمارے ربّ! تو عطا کر ہم کو اپنے خزانے سے کچھ رحمت اور تو اسباب پیدا کر ہمارے لیے ہمارے کام میں بھلائی کی راہ کے۔‘‘

ن ف خ

نَفَخَ (ن) نَفْخًا :پھونک مارنا۔آیت زیر مطالعہ۔

نَفْخَةٌ (اسم ذات) :پھونک۔﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴾ (الحاقّة) ''پھر جب پھونکی جائے گی صور میں پہلی پھونک۔''

ک م ھ

کَمِهَ (س) کَمْهًا :اندھا ہونا۔

اَکْمَهُ (افعل التفضیل) :زیادہ اندھا' یعنی پیدائشی اندھا۔آیت زیر مطالعہ۔

ب ر ص

بَرِصَ (س) بَرَصًا :برص کا مریض ہونا۔

اَبْرَصُ (افعل التفضیل) :برص کا پرانا مریض' کوڑھی۔آیت زیر مطالعہ۔

ذ خ ر

ذَخَرَ (ف) ذَخْرًا :وقتِ ضرورت کے لیے جمع کرنا۔

اَدَّخَرَ (افتعال) اِدِّخَارًا :مستقبل کے لیے اہتمام سے جمع کرنا' ذخیرہ کرنا۔آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''رَسُوْلًا'' سے پہلے اگر ''یُبْعَثُ'' کو محذوف مانیں تو ''رَسُوْلًا'' اس کا مفعول ثانی ہے' اور اگر ''یَکُوْنُ'' کو محذوف مانیں تو ''رَسُوْلًا'' اس کی خبر ہے۔دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔اسی طرح ''اَنِّیْ'' سے پہلے ''وَیَقُوْلُ'' محذوف ہے۔''تَدَّخِرُوْنَ'' مادہ ''ذ خ ر'' سے باب افتعال میں جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔یہ اصلاً ''تَذْتَخِرُوْنَ'' تھا۔پھر قاعدے کے مطابق افتعال کی ''تا'' کو ''ذ'' میں تبدیل کر کے ادغام کیا تو ''تَذَّخِرُوْنَ'' ہوا' اور یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔پھر 'ذ' کو 'د' میں تبدیل کرنا قرآن مجید کی خصوصیت ہے۔

ترجمہ:

وَرَسُوْلاً :اور (وہ ہوں گے) ایک رسول	اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ :بنواسرائیل کی طرف
اَنِّیْ :(وہ کہیں گے) کہ مَیں	قَدْ جِئْتُکُمْ :آیا ہوں تمہارے پاس
بِاٰیَةٍ :ایک نشانی کے ساتھ	مِّنْ رَّبِّکُمْ :تمہارے ربّ (کی طرف) سے
اَنِّیْ :کہ مَیں	اَخْلُقُ :بناتا ہوں
لَکُمْ :تمہارے لیے	مِّنَ الطِّیْنِ :گارے سے
کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ :پرندوں کی شکل جیسا	فَاَنْفُخُ :پھر میں پھونکتا ہوں

فِيْهِ :اس میں	فَيَكُوْنُ :تو وہ ہو جاتا ہے
طَيْرًا :اڑنے والا	بِاِذْنِ اللّٰهِ :اللہ کی اجازت سے
وَاُبْرِئُ :اور مَیں شفا دیتا ہوں	الْاَكْمَهَ :پیدائشی اندھے کو
وَالْاَبْرَصَ :اور کوڑھی کو	وَاُحْيِ :اور مَیں زندہ کرتا ہوں
الْمَوْتٰى :مردہ کو	بِاِذْنِ اللّٰهِ :اللہ کی اجازت سے
وَاُنَبِّئُكُمْ :اور میں بتا دیتا ہوں تم لوگوں کو	بِمَا :وہ جو
تَاْكُلُوْنَ :تم لوگ کھاتے ہو	وَمَا :اور وہ جو
تَدَّخِرُوْنَ :تم لوگ ذخیرہ کرتے ہو	فِيْ بُيُوْتِكُمْ :اپنے گھروں میں
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ بے شک اس میں	لَاٰيَةً :ایک نشانی ہے
لَّكُمْ :تمہارے لیے	اِنْ كُنْتُمْ :اگر تم لوگ ہو
مُّؤْمِنِيْنَ :ایمان لانے والے	

آیات ۵۰، ۵۱

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۠ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾

ترکیب :''مُصَدِّقًا'' حال ہے۔''بَيْنَ يَدَيْنَ'' میں ''يَدَيْنَ'' مضاف بنا تو نون اعرابی گر گیا اور اس کی مضاف الیہ ''یائے متکلم'' آئی تو یہ ''يَدَيْ يَ'' ہوا۔ پھر دونوں ''یا'' کا ادغام کر کے ''يَدَيَّ'' بنا۔ ''اَطِيْعُوْا'' فعل امر ہے اور ''نِ'' ضمیر مفعولی ''نِیْ'' کا نونِ وقایہ ہے۔ دیکھئے البقرۃ کی آیت ۴۰ کی ترکیب۔

ترجمہ:

وَمُصَدِّقًا :اور تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے	لِّمَا :اس کی جو
بَيْنَ يَدَيَّ :میرے سامنے ہے	مِنَ التَّوْرٰىةِ :تورات میں سے
وَلِاُحِلَّ :اور تا کہ مَیں حلال کروں	لَكُمْ :تمہارے لیے
بَعْضَ الَّذِيْ :اس کے کچھ کو جو	حُرِّمَ :حرام کیا گیا
عَلَيْكُمْ :تم لوگوں پر	وَجِئْتُكُمْ :اور میں آیا ہوں تمہارے پاس
بِاٰيَةٍ :ایک نشانی کے ساتھ	مِّنْ رَّبِّكُمْ :تمہارے ربّ (کی طرف) سے

فَاتَّقُوا :پس تم لوگ تقویٰ کرو — اللّٰہَ :اللہ کا
وَاَطِیۡعُوۡنِ :اوراطاعت کرومیری — اِنَّ اللّٰہَ :یقیناً اللہ
رَبِّیۡ :میرا ربّ ہے — وَرَبُّکُمۡ :اورتمہارا ربّ ہے
فَاعۡبُدُوۡہُ :پس تم لوگ بندگی کرواس کی — ھٰذَا :یہ
صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ :ایک سیدھا راستہ ہے

نوٹ: آیات ۴۹ اور ۵۰ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ d کی بعثت صرف بنواسرائیل کے لیے تھی‘ تمام عالم کے لیے نہیں تھی۔ وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے‘ بلکہ شریعت موسوی کی تجدید کے لیے آئے تھے۔اور یہ کام انہوں نے اُس تورات سے کیا جو اُس زمانے میں یہودیوں کے پاس تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر صورت حال یہ تھی تو پھر انؑ کا بعض حرام چیزوں کو حلال کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس ضمن میں دو آراء ہیں: ایک یہ کہ شریعت موسوی کے بعض سخت احکام میں نرمی کی‘ جیسے ایامِ سبت کے احکام بہت سخت تھے‘ جنہیں نرم کیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ علماءِ یہود کے اختلاف‘ رہبانیت پسند لوگوں کے تشدد اور جہلاء کے توہم کی وجہ سے شریعت موسوی میں بعض ایسی چیزیں حرام قرار پا گئی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ d نے اُس وقت کی موجود تورات کی سند پر ایسی چیزوں کو دوبارہ حلال کیا۔ آیت ۵۰ میں ماضی مجہول کا لفظ ’’حُرِّمَ‘‘ آیا ہے جس سے دوسری رائے کو تقویت ملتی ہے‘ لیکن پہلی رائے کو بھی غلط قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس امکان کو بھی رد نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰؑ نے مذکورہ دونوں کام کیے ہوں۔

آیات ۵۲ تا ۵۴

﴿فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡہُمُ الۡکُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشۡہَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ وَاتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاکۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰہِدِیۡنَ ﴿۵۳﴾ وَمَکَرُوۡا وَمَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ﴿۵۴﴾﴾

ح س س

حَسَّ (ن) حَسًّا :جڑ سے اکھاڑنا‘ قتل کرنا۔ ﴿اِذۡ تَحُسُّوۡنَہُمۡ بِاِذۡنِہٖ﴾ (آل عمران:۱۵۲) ’’جب تم لوگ قتل کرتے تھے ان کو اس کی اجازت سے۔‘‘

حَسَّ (ض) حِسًّا :حواسِ خمسہ کے ذریعہ کسی بات کا پتا چلنا‘ محسوس ہونا۔

حَسِیۡسٌ (فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت) : ہلکی اور پست آواز‘ سرسراہٹ۔ ﴿لَا یَسۡمَعُوۡنَ

حَسِيْسَهَا﴾ (الانبیاء:۱۰۲) ''وہ لوگ نہیں سنیں گے اس کی سرسراہٹ۔''

اَحَسَّ (افعال) اِحْسَاسًا :حواسِ خمسہ کے ذریعے پتا چلانا' احساس کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

تَحَسَّسَ (تفعّل) تَحَسُّسًا: کوشش کر کے پتا چلانا' سراغ لگانا۔

تَحَسَّسْ (فعل امر) : تو سراغ لگا۔ ﴿يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ﴾ (یوسف:۸۷) ''اے میرے بیٹو تم لوگ جاؤ پھر سراغ لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا۔''

م ک ر

مَكَرَ (ن) مَكْرًا :خفیہ تدبیر کرنا' چال چلنا (اچھے اور برے' دونوں مقصد کے لیے آتا ہے)۔ آیت زیر مطالعہ۔

مَكْرٌ (اسم ذات بھی ہے) : تدبیر' چال۔ ﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (فاطر:۴۳) ''اور نہیں پڑتی بری چال مگر اپنے اہل پر (یعنی چال چلنے والے پر)۔''

مَاكِرٌ (اسم الفاعل) : تدبیر کرنے والا' چال چلنے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترجمہ:

فَلَمَّآ : پھر جب	اَحَسَّ :احساس کیا
عِيْسٰى :عیسیٰؑ نے	مِنْهُمُ :ان لوگوں سے
الْكُفْرَ :انکار کا	قَالَ :(تو) انہوں نے کہا
مَنْ :کون	اَنْصَارِيْ :میرا مددگار ہے
اِلَى اللّٰهِ :اللہ کی طرف	قَالَ :کہا
الْحَوَارِيُّوْنَ :حواریوں نے	نَحْنُ :ہم
اَنْصَارُ اللّٰهِ :اللہ کے مددگار ہیں	اٰمَنَّا :ہم ایمان لائے
بِاللّٰهِ :اللہ پر	وَاشْهَدْ :اور آپؑ گواہی دیں
بِاَنَّا :کہ ہم	مُسْلِمُوْنَ :فرماں برداری قبول کرنے والے ہیں
رَبَّنَا :اے ہمارے ربّ	اٰمَنَّا :ہم ایمان لائے
بِمَآ :اس پر جو	اَنْزَلْتَ :تو نے اتارا
وَاتَّبَعْنَا :اور ہم نے پیروی کی	الرَّسُوْلَ :ان رسولؑ کی
فَاكْتُبْنَا :پس تو لکھ دے ہم کو	مَعَ الشّٰهِدِيْنَ : گواہی دینے والوں کے ساتھ

وَمَكَرُوْا :اوران لوگوں نے چال چلی　　وَمَكَرَ :اورتدبیر کی
اللّٰهُ :اللہ نے　　وَاللّٰهُ :اوراللہ
خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ: بہترین تدبیر کرنے والا ہے

آیات ۵۵ تا ۵۷

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۞ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۞ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

ترکیب :''مَرْجِعُكُمْ'' مبتدأ مؤخر ہے۔اس کی خبر محذوف ہے اور قائم مقام خبر مقدم ہے۔اس میں ''مَرْجِعٌ'' مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اسم الظرف بھی۔ہم مصدر ہونے کو ترجیح دیں گے۔''اُعَذِّبُ'' کا مفعول ''هُمْ'' ہے اور ''عَذَابًا شَدِيْدًا'' مفعول مطلق ہے۔''مِنْ نّٰصِرِيْنَ'' کا ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔

ترجمہ:

اِذْ قَالَ :جب کہا　　اللّٰهُ :اللہ نے
يٰعِيْسٰٓى :اے عیسیٰؑ　　اِنِّىْ :بے شک میں
مُتَوَفِّيْكَ پورا پورا لینے والا ہوں آپؑ کو　　وَرَافِعُكَ اور میں اٹھانے والا ہوں آپؑ کو
اِلَىَّ :اپنی طرف　　وَمُطَهِّرُكَ اور میں نجات دلانے والا ہوں آپؑ کو
مِنَ الَّذِيْنَ :ان لوگوں سے جنہوں نے　　كَفَرُوْا :انکار کیا
وَجَاعِلُ :اور میں بنانے والا ہوں　　الَّذِيْنَ :ان کو جنہوں نے
اتَّبَعُوْكَ پیروی کی آپؑ کی　　فَوْقَ الَّذِيْنَ :ان سے اوپر جنہوں نے
كَفَرُوْٓا :انکار کیا　　اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: قیامت کے دن تک
ثُمَّ :پھر　　اِلَىَّ :میری طرف ہی
مَرْجِعُكُمْ :تم لوگوں کا لوٹنا ہے　　فَاَحْكُمُ :تب میں فیصلہ کروں گا
بَيْنَكُمْ :تمہارے مابین　　فِيْمَا :اس میں

كُنْتُمْ :تم لوگ	فِيْهِ :جس میں
تَخْتَلِفُوْنَ :اختلاف کرتے تھے	فَاَمَّا الَّذِيْنَ :پس وہ جنہوں نے
كَفَرُوْا :انکار کیا	فَاُعَذِّبُهُمْ :ان کو تو میں عذاب دوں گا
عَذَابًا شَدِيْدًا :ایک شدید عذاب	فِي الدُّنْيَا :دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ :اور آخرت میں	وَمَا لَهُمْ :اور ان کے لیے نہیں ہے
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ :کسی قسم کا کوئی مدد کرنے والا	وَاَمَّا الَّذِيْنَ :اور وہ جو
اٰمَنُوْا :ایمان لائے	وَعَمِلُوا :اور انہوں نے عمل کیے
الصّٰلِحٰتِ :نیک	فَيُوَفِّيْهِمْ :ان کو تو وہ پورا پورا دے گا
اُجُوْرَهُمْ :ان کے اجر	وَاللّٰهُ :اور اللہ
لَا يُحِبُّ :پسند نہیں کرتا	الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والوں کو

نوٹ :البقرۃ کی آیت ۴۰ کی لغت میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ باب تفعّل میں ''تَوَفّٰی' یَتَوَفّٰی'' کے اصلی معنی ہیں ''پورا پورا لے لینا''۔ پھر اس سے موت دینا مراد لیا جاتا ہے جو کہ اس کے مجازی معنیٰ ہیں۔ اس آیت میں لفظ ''مُتَوَفِّیْ'' آیا ہے' جو اس کا اسم الفاعل ہے۔ اس کے اصلی معنی ہیں پورا پورا لے لینے والا' اور اس کے مجازی معنی ہیں موت دینے والا۔

اس قسم کے الفاظ کے متعلق اصول یہ ہے کہ عبارت یا جملہ میں کوئی ایسا قرینہ موجود ہو کہ ایسے لفظ کے اصلی معنی لینا ممکن نہ ہو' تب مجازی معنی لیے جاتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہو کہ مجازی معنی لینا ضروری ہو۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہ ہو تو پھر عام طور پر لفظ کے اصلی معنی ہی لیے جاتے ہیں۔

آیت زیر مطالعہ میں مذکورہ دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت موجود نہیں ہے۔ اس لیے اصولاً ''مُتَوَفِّيْكَ'' کا اصلی معنی ہی لیا جانا چاہیے۔ اب یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ یہاں ایک ایسا قرینہ موجود ہے جس کی وجہ سے مجازی معنی لینا ممکن نہیں رہتا۔ اور وہ یہ ہے کہ ''اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ'' کے بعد ''وَرَافِعُكَ'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ لفظ ''مُتَوَفِّیْ'' کا معنیٰ مراد' یعنی صاحبِ کلام کا مطلب اگر ''موت دینے والا'' ہوتا تو پھر ''رَافِعُكَ'' کا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس اضافے نے ''مُتَوَفِّیْ'' کے مجازی معنی کے امکان کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔

فعل ''رَفَعَ'' بھی دو معانی میں آتا ہے: (۱) جسمانی طور پر اٹھانا۔ (۲) درجات یا رتبہ کے لحاظ سے بلند کرنا۔ قرآن مجید میں اس کے مختلف صیغے اور مشتقات ۲۹ مقامات پر آئے ہیں' کہیں پہلے اور کہیں دوسرے معنی میں۔ اس ضمن میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اس کے ساتھ

''اِلٰی'' کا صلہ صرف دو مقامات پر آیا ہے' ایک آیت زیر مطالعہ میں اور دوسرا سورۃ النساء کی آیت ۱۵۸ میں۔ دونوں جگہ پر یہ حضرت عیسیٰ d کے لیے آیا ہے اور دونوں جگہ ''اِلٰی'' کی نسبت اللہ کی طرف ہے۔ اس کی وجہ سے یہ امکان ختم ہو جاتا ہے کہ مذکورہ دونوں مقامات پر حضرت عیسیٰ d کے رتبہ کی بلندی کا معنی لیا جائے۔ اس لیے اس آیت کا معنیٔ مراد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ d کو ان کے جسم کے ساتھ اللہ نے آسمان میں اٹھایا۔

جو لوگ اس آیت میں لفظ ''مُتَوَفِّیْ'' کا مطلب ''موت دینے والا'' لیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اُمت کے مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس i نے بھی اس کے یہی معنی لیے ہیں۔ یہ بات درست ہے' لیکن انہوںؓ نے آیت کے معنیٔ مراد کو بھی قائم رکھا ہے۔ انہوںؓ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''میں آپؑ کو اپنی طرف اٹھالوں گا' پھر آخر زمانہ میں آپؑ کو طبعی طور پر وفات دوں گا''۔ (درمنثور' ج ۲' ص ۳۶' منقول از معارف القرآن)۔ یعنی آیت کے الفاظ میں تقدیم وتأخیر ہے۔ پہلے ''رَافِعُکَ'' کا وقوع ہوگا اور اس کے بعد ''مُتَوَفِّیْکَ'' کا وقوع ہوگا۔

امام رازیؒ نے نشاندہی کی ہے کہ بعض مصلحتوں کے تحت قرآن کریم میں اس طرح کی تقدیم وتأخیر بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونے والے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا (تفسیر کبیر' ج ۲' ص ۴۸۱' منقول از معارف القرآن)۔ آیت زیر مطالعہ میں تقدیم وتأخیر کس مصلحت سے کی گئی ہے' اس کی وضاحت معارف القرآن میں دی ہوئی ہے۔ خواہش مند حضرات وہاں سے مطالعہ کرلیں۔

اس طرح آیت زیر مطالعہ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۵۸ نص صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ d کو جسمانی طور پر آسمان میں اٹھایا ہے۔ اور حضرت ابن عباس i کی تفسیر کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے دنیا میں واپس آنے کی سند بھی آیت زیر مطالعہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک سو سے زائد احادیث میں مختلف پیرائے میں جو خبریں دی گئی ہیں ان کی وجہ سے حضرت عیسیٰ d کا رفع جسمانی اور ان کی واپسی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔oo

محاسبے کی فکر

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ اُیُّوْبَ اَنَّ اَعْرَابِیًا عَرَضَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ فِیْ سَفَرٍ فَاَخَذَ بِخِطَامِ نَاقَتِہٖ [اَوْ بِزِمَامِھَا] ثُمَّ قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ [اَوْ یَا مُحَمَّدُ] اَخْبِرْنِیْ بِمَا یُقَرِّبُنِیْ مِنَ الْجَنَّۃِ وَمَا یُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ. قَالَ فَکَفَّ النَّبِیُّ ﷺ ثُمَّ نَظَرَ فِیْ اَصْحَابِہٖ ثُمَّ قَالَ: ((لَقَدْ وُفِّقَ اَوْ لَقَدْ ھُدِیَ)) قَالَ: ((کَیْفَ قُلْتَ؟)) قَالَ: فَاَعَادَ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: ((تَعْبُدُ اللّٰہَ لاَ تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلاَۃَ وَتُؤْتِی الزَّکَاۃَ وَتَصِلُ الرَّحِمَ، دَعِ النَّاقَۃَ)) (رواہ مسلم)☆

''حضرت ابوایوب h راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے کہ ایک بدوی سامنے آ کھڑا ہوا اور اُس نے آپؐ کی ناقہ کی مہار پکڑ لی، پھر کہا: اے اللہ کے رسول! (یا آپ کا نام لے کر کہا کہ اے محمدؐ!) مجھے وہ بات بتائیے جو مجھے جنت سے قریب اور آتش دوزخ سے دور کر دے۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ رک گئے (یعنی آپؐ نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے اپنی ناقہ کو روک لیا) پھر آپؐ نے اپنے رفقاء کی طرف دیکھا اور (اُن کو متوجہ کرتے ہوئے) فرمایا: ''اس کو اچھی توفیق ملی (یا فرمایا کہ اس کو خوب ہدایت ملی)''۔ پھر آپؐ نے اس اعرابی سائل سے فرمایا کہ ''ہاں! ذرا پھر کہنا تم نے کس طرح کہا؟'' راوی کہتے ہیں کہ سائل نے اپنا وہی سوال پھر دہرایا (کہ مجھے وہ بات بتا دیں جو مجھے جنت سے نزدیک اور دوزخ سے دور کر دے) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''عبادت اور بندگی کرتے رہو صرف اللہ کی اور کسی چیز کو اُس کے ساتھ کسی طرح بھی شریک نہ کرو، اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور صلۂ رحمی کرو (یعنی اپنے اہل قرابت کے ساتھ حسبِ مراتب اچھا سلوک رکھو، اور ان کے حقوق ادا کرو۔) پھر آپؐ نے اُس بدوی سے فرمایا کہ ''اب ہماری ناقہ کی مہار چھوڑ دو۔''

جس شخص کا آخرت پر ایمان ہے اُسے ہر وقت محاسبے کی فکر رہتی ہے، لہٰذا وہ حساب کے دن کامیابی کا متمنی ہوتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت ایک سیدھے سادے دیہاتی مسلمان نے رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑ لی اور پوچھنے لگا کہ مجھے وہ عمل بتائیے جو مجھے جنت سے قریب کر دے اور جہنم کی آگ سے دور

☆ کتاب الایمان، باب بیان الایمان الذی یدخل به الجنة وان من تمسك بما امر به دخل الجنة۔

کردے۔ رسول اللہ ﷺ اُس بدوی کی خاطر رک گئے۔ بدوی کے سوال پر آپؐ نے صحابہ کرام j کی طرف نظر کی اور بدوی کو فرمایا کہ اپنا سوال دہرائیے۔ غرض یہ تھی کہ آپؐ کے ساتھی متوجہ ہو کر پہلے سوال سنیں اور پھر اس کا جواب بھی سن لیں۔ کیونکہ جنت میں داخلہ اور دوزخ سے بچاؤ ہر ایک کی تمنا ہے۔ جب بدوی نے سوال دہرایا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''اللہ کی عبادت کرتے رہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور نماز کی پابندی کرو' زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور صلہ رحمی کرو۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''اب ہماری اونٹنی کی مہار چھوڑ دو!''

اس حدیث میں ہمیں کئی طرح کی تعلیم ملتی ہے۔ اوّل یہ کہ راوی کو تین جگہ پر تین الفاظ کے متعلق شک ہوا تو اُس نے تینوں جگہ اس کا اظہار کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ راویانِ حدیث نے حدیث بیان کرنے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔ دوم یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا اخلاق کس درجہ بلند تھا کہ ایک بدوی نے دورانِ سفر آپؐ کی ناقہ کی مہار پکڑ کر آپؐ کو روک لیا مگر آپؐ نے اُس کے اس رویے کا برا نہیں منایا' بلکہ اس کے سوال کا جواب دے کر اسے مطمئن کیا اور پیار سے فرمایا کہ اب ہماری ناقہ کی مہار چھوڑ دو۔ حسن اخلاق کے اس طرح کے نمونے آپؐ کی سیرت کا حصہ اور اُمت کے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہیں۔

جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کرنے والے اعمال کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے حالات کے مطابق مختصر جواب دیا مگر وہ جواب جوامع الکلم کی مثال ہے۔ آپؐ نے توحید پر قائم رہنے کے لیے شرک سے مکمل طور پر اجتناب کی تلقین کی۔ اس لیے کہ شرک سے اجتناب کے بغیر توحید پر ایمان ممکن نہیں۔ توحید پر ایسا ایمان جس میں شرکیہ اعمال شامل ہوں' صرف زبان کا ایمان ہے' جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ دیگر گناہوں کے برعکس شرک اللہ کے ہاں ناقابل معافی جرم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ﴾(النساء:٤٨ و ١١٦)

''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا' اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾(المائدۃ:٧٢)

''بے شک جس نے شرک کیا اللہ کے ساتھ تو اللہ نے اس پر جنت میں داخلہ حرام قرار دے دیا ہے اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔''

پس جنت سے قریب اور دوزخ سے دور رکھنے والے اعمال میں سرفہرست شرک سے بچنا ہے' جس کی رسول اللہ ﷺ نے بدوی کو تلقین کی۔ پھر آپؐ نے نماز کی پابندی کی ہدایت کی کہ نماز شعائر اسلام میں سے

ہے۔ یہ اسلام کا رکن رکین اور مسلمان کی شناختی علامت ہے۔ قیامت کے روز اوّلاً نماز ہی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ نماز انسان کے کردار میں پختگی پیدا کر کے اسے نیکی کی طرف راغب کرتی اور برائیوں سے بچاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ (العنکبوت:۴۵)

''بے شک نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔''

پھر نبی اکرم ﷺ نے زکوٰۃ کی ادائیگی کی تلقین کی' کیونکہ زکوٰۃ انسان کو مال کی محبت میں گرفتار نہیں ہونے دیتی اور انفاق فی سبیل اللہ کے بریک کو توڑتی ہے۔ مال کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ دولت بہت سے گناہوں کا باعث ہے۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا شقاوتِ قلبی کا شکار ہو جاتا ہے' کیونکہ اسے معاشرے کے گرے پڑے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ بالآخر مال کی محبت انسان کو برے انجام تک پہنچا دیتی ہے۔ آخری بات جو آپ ﷺ نے فرمائی' وہ صلہ رحمی ہے۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم قرآن میں اِن الفاظ میں دیا گیا ہے:

﴿وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی.....﴾(البقرۃ:۸۳)

''اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ.....''

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام j کو صلہ رحمی کی اہمیت بتائی تو آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر رشتہ دار اچھا سلوک نہ کریں تو ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو تم سے قطع تعلق کرے تم اس کے ساتھ جڑو۔ اس لیے کہ جو ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرے اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا تو کوئی بڑی بات نہیں' البتہ جو رشتہ دار اچھا سلوک نہ کرے اُس کے ساتھ بھلائی کرنا ہی اصل نیکی ہے۔ رشتہ دار اچھے ہوں یا برے سب ہی صلہ رحمی کے مستحق ہیں۔ جب معاشرے میں صلہ رحمی عام ہوگی تو سب کی زندگی میں سکون واطمینان ہوگا۔ صلہ رحمی دراصل اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے' کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا بھائی بنایا ہے ہمیں اسے اپنا بھائی سمجھنا چاہیے' اس کے ساتھ تعلقات بگاڑنے نہیں چاہئیں۔ صلہ رحمی کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر ماں' باپ' بہن بھائی کافر ہوں تو بھی اُن کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا﴾ (لقمٰن:۱۵)

''اور اگر وہ (تمہارے والدین) تم پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا (کیونکہ شرک کی کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے) تو اُن کی بات ہرگز نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ!''

صلہ رحمی نہ کرنا دوزخ میں جانے کا باعث بن سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَاطِعٌ)) (۱)

''تعلق قطع کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا''۔

ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں روزے اور حج کا ذکر نہیں' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ دین کی تفصیلات نہیں بتا رہے' بلکہ اس شخص کے حسب حال اس کے سوال کا مختصر جواب دے رہے ہیں۔ مگر یہاں بھی گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص نماز ادا کرتا ہے اور زکوٰۃ بھی دیتا ہے' وہ روزے ضرور رکھے گا اور استطاعت ہوگی تو حج بھی ضرور کرے گا۔ روزہ تو ایسی دلچسپ عبادت ہے کہ بچے بھی ضد کر کے روزہ رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو نماز کی پابندی نہیں کرتے' روزہ وہ بھی رکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح صاحب مال لوگ کئی کئی حج کر لیتے ہیں' مگر بہت سے حاجی ایسے ہیں جو حج تو کر لیتے ہیں لیکن نماز قائم نہیں کرتے۔ گویا روزہ اور حج نماز کی پابندی کرنے والے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے افراد کے لیے آسان ہے' البتہ روزے رکھنے اور حج کرنے والوں کے لیے نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی سہل نہیں۔ بس آپؐ نے مختصر مگر حکمت بھرے الفاظ میں سائل کو جنت کے قریب اور دوزخ سے دور رکھنے والے اعمال بتا دیے۔

صحیح مسلم میں اس حدیث کی دوسری روایت کے آخر میں ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ جب وہ اعرابی چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنْ تَمَسَّکَ بِمَا اُمِرَ بِہٖ دَخَلَ الْجَنَّۃَ)) ''اگر یہ مضبوطی سے ان احکام پر عمل کرتا رہا جن کا اسے حکم دیا گیا ہے تو یقیناً جنت میں جائے گا''۔ اس طرح نہ صرف سائل نے آپؐ سے اپنے سوال کا جواب پا لیا بلکہ حاضرین نے بھی آپؐ کی گفتگو سے راہنمائی پائی۔ oo

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم القاطع۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب صلة الرحم وتحریم قطیعتها۔

جرائد 2007ء CD

ماہنامہ **میثاق**' ماہنامہ **حکمت قرآن** اور ہفت روزہ **ندائے خلافت**
کے سال 2007ء کے تمام شمارے ایک ''سی ڈی'' میں دستیاب ہیں

قیمت: 30 روپے (علاوہ ڈاک خرچ ☆)

تنظیم اسلامی کے حلقہ جات' مقامی دفاتر اور انجمن ہائے خدام القرآن اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

☆ (i) بذریعہ وی پی پی / منی آرڈر منگوانے والے اصحاب کو یہ سی ڈی -/110 روپے میں ملے گی۔ منی آرڈر / وی پی پی فیس -/50 روپے + ڈاک خرچ -/30 روپے + سی ڈی کی قیمت -/30 روپے ٹوٹل -/110 روپے۔ (ii) اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ -/60 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر یہ سی ڈی طلب فرمائیں یا پھر اپنے قریبی تنظیمی سیل آفس سے حاصل کریں۔

مکتبہ خدام القرآن لاہور 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-5869501
email:maktaba@tanzeem.org

تفسیر آیات الاحکام

چند بنیادی مباحث

حافظ طاہر اسلام عسکری ☆

زیر نظر تحریر کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں قرآن حکیم کی تفسیر سے متعلق کچھ اصولی نکات کی توضیح ہوگی، جبکہ دوسرے حصے میں آیات الاحکام اور ان کی تفسیر کے بارے میں چند گزارشات پیش کی جائیں گی۔ واللّٰہ المُستعان۔

✌ تفسیر قرآن سے متعلق چند اصولی نکات کی وضاحت

یہاں اصول تفسیر کے حوالے سے کوئی تفصیلی گفتگو پیش نظر نہیں، بلکہ صرف انہی پہلوؤں کا تذکرہ مقصود ہے جن میں افراط وتفریط کا رویہ اپنایا گیا ہے، جس سے کلامِ الٰہی کی تفسیر کے سلسلے میں مختلف فتنوں نے جنم لیا ہے۔

(۱) تفسیر قرآن میں حدیث وسنت کا مقام

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کلام سے مرادِ الٰہی کو واضح کرنا تفسیر کہلاتا ہے۔ مطالعۂ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظِ قرآن کی تفسیر، شرح اور وضاحت، جسے اصطلاحِ قرآنی میں 'بیان' کہا گیا ہے، بھی خود خدا کے ذمہ ہے۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ (القیٰمة) ''پھر اس کا واضح کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ کسی کلام کا حقیقی مدعا صحیح معنوں میں خود متکلم ہی واضح کر سکتا ہے۔ پھر قرآن سے ایک اور حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ قرآن کا یہ بیان قرآن سے الگ ہے اور خدا نے اپنے نمائندے کے ذریعے کیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا سیدنا محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

☆ شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

﴿ وَاَنْزَلْنَـآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (النحل)

''ہم نے یہ ذکر آپؐ پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے لیے اس شے کو کھول کھول کر بیان فرمادیں جو اُن کی طرف اتاری گئی' شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔''

اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ اس ذمہ داری کو رسولِ مکرم ﷺ نے بتمام وکمال پورا کیا اور الفاظ قرآن کے علاوہ اس کا ''بیان'' بھی اُمت تک پہنچایا۔ اسی آیت کی بنیاد پر اہل علم نے کہا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام j کو جس طرح قرآن مجید کے الفاظ سکھائے اسی طرح اس کے معانی بھی سکھائے۔[1] لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ بیان رسول اکرم ﷺ اپنے پاس سے گھڑ کر لوگوں تک پہنچاتے تھے' بلکہ یہ بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)) [2]

''آگاہ رہو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل بھی (یعنی حدیث وسنت)''۔ ☆

چنانچہ حدیث وسنت کا یہ سارا ذخیرہ دراصل قرآن کا وہی بیان ہے جو وحی کی صورت میں آپؐ پر نازل فرمایا گیا اور قرآن وسنت ایک ہی روشنی کی دو کرنیں ہیں۔ علمائے سلف نے بھی اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن کریم کی طرح حدیث وسنت بھی منزل من اللہ ہے۔ امام اوزاعیؒ حسان بن عطیہؒ سے بیان روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: **كان جبريل ينزل على رسول اللهﷺ بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن ويعلمه السنة كما يعلمه القرآن**[3] یعنی ''جبریلؑ جس طرح رسول اکرم ﷺ کے پاس قرآن مجید لے کر نازل ہوتے تھے اسی طرح سنت لے کر اترتے تھے۔ اور قرآن کی طرح سنت کی بھی تعلیم دیتے تھے''۔ قرآن مجید اور سنت رسولؐ کا یہ تعلق اتنا مستحکم اور مضبوط ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ))[4]

''یہ دونوں علیحدہ نہیں ہوں گے' یہاں تک کہ حوض کوثر میں مجھ پر پیش ہوں۔''

عصر حاضر میں ''تفسیر قرآن'' کے سلسلہ میں جو فتنے نظر آتے ہیں ان کی اصل جڑ یہی ہے کہ حدیث وسنت کو وحی تسلیم نہیں کیا جاتا اور وحی کو صرف قرآن ہی میں محصور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا دلائل اس کی

☆ اس حدیث پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ قرآن کی رو سے تو اس کا کوئی مثل ہو ہی نہیں سکتا: ﴿لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ (الاسراء:۸۸) لیکن یہ بات کم فہمی پر مبنی ہے۔ مثلیت کے کئی پہلو ہیں۔ معجزہ ہونے کے اعتبار سے تو اس کا کوئی مثل نہیں' لیکن صحت اور سند ہونے کے اعتبار سے حدیث قرآن کی مثل ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾ (الشوریٰ) اور دوسری طرف انسان کے بارے میں فرمایا: ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝﴾ (الدھر) اب اللہ بھی سمیع وبصیر ہے اور انسان بھی' لیکن اس کے باوجود اللہ کا کوئی مثل بھی نہیں۔ (مضمون نگار)

بھرپور تردید کرتے ہیں۔

چنانچہ کچھ لوگ تو حدیث وسنت کی صحت کے سرے سے ہی منکر ہیں اور رسول اکرم ﷺ کو محض ایک ڈاکیا سمجھتے ہیں کہ آپؐ اُمت کو الفاظِ قرآن دے گئے اور بس‘ آپؐ کی ذمہ داری ختم۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کے مجملات کی توضیح اور عمومات کی تخصیص ''مرکز ملت'' کے سپرد ہے‘ یا پھر کوئی مفکر قرآن اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں ''معارفِ قرآن'' بیان کرے گا‘ لغت عرب کے ذریعے لوگوں کو ''مطالبِ فرقان'' سمجھائے گا اور ''روایات وآثار'' کے بجائے اپنی خداداد فہم و ذہانت سے ''مفہوم القرآن'' کی وضاحت کرے گا۔ اس طرزِ فکر کو سورۃ النحل کی آیت ۴۴ مکمل طور پر مسترد کرتی ہے‘ جہاں تبیین قرآن کو نزولِ قرآن کا مقصودِ اصلی اور آپ ﷺ کی بنیادی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو بعض اعتبارات سے پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک ہے‘ کیونکہ وہ حدیث و سنت کے اتھارٹی ہونے کا علی الاعلان منکر تو نہیں‘ لیکن وہ اسے وحی ماننے پر بھی تیار نہیں۔ مزید برآں اس نے حدیث وسنت میں ایک نیا فرق بھی ایجاد کر لیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے جس عمل پر اُمت کا صریح اجماع یا عملی تواتر مل جائے وہ تو سنت ہے اور قابل اعتبار ہے‘ لیکن حدیث کی یہ حیثیت نہیں‘ لہٰذا وہ اس قابل نہیں کہ اسے تفسیر قرآن کے قطعی ماخذوں میں شامل کیا جا سکے‘ لیکن اس گروہ کے مطابق ذاتی فہم کی بنا پر سمجھا گیا نظم قرآن اور ادب جاہلی قرآن کی تفسیر کے قطعی مآخذ ہیں!! اسی طرزِ فکر کی بنا پر وہ احادیث کو یا تو خلافِ قرآن کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں یا پھر ان کی عجیب وغریب تأویلات کر کے ان کے اصل مفہوم ہی کو بدل دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث وسنت کا یہ فرق اہل فن سے ثابت ہی نہیں۔ اس سے رسول اکرم ﷺ کے وہ سارے افعال واقوال سنت سے خارج ہو جاتے ہیں جن کو تواتر عملی حاصل نہ ہو سکا اور سنتوں کی تعداد سکڑ کر بہت کم رہ جاتی ہے۔ پھر یہ امر بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ حدیث کا قرآن کے مخالف ہونا امر محال ہے‘ اس لیے یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو سنت کے منزل من اللہ ہونے کا انکاری ہو۔ جلیل القدر تابعی سیدنا سعید بن جبیرؒ نے ایک مرتبہ کوئی حدیث بیان کی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ تو قرآن کے خلاف ہے‘ تو انہوں نے اس پر اظہارِ ناپسندیدگی کرتے ہوئے کہا کہ رسول معظم ﷺ تجھ سے زیادہ قرآن جانتے تھے۔(۵)

المختصر قرآن مجید کی تفسیر کا اوّلین اور بنیادی مأخذ سنت رسول ہے اور اس کے بغیر تفسیر قرآن ناممکن ہے۔ بلکہ سلف صالحینؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ **القرآن احوج الی السنة من السنة الی القرآن**(۶) یعنی ''قرآن مجید اپنی وضاحت میں جس قدر سنت کا محتاج ہے‘ سنت کے مطالب کی وضاحت کے لیے قرآن کی اتنی ضرورت نہیں''۔ اور امام یحییٰ بن ابی کثیرؒ فرماتے ہیں کہ **السنة قاضية على الكتاب**(۷) یعنی ''سنت قرآن مجید کے مطالب ومعانی کے سلسلہ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے''۔ ☆ بنابریں حدیث و

☆ بعض اہل علم نے اس اندازِ تعبیر کو مناسب نہیں سمجھا (جیسے امام احمد بن حنبلؒ)۔ لیکن اس کا اصل مقصود ◀◀

سنت سے استفادہ اور رسول اکرم ﷺ کے بیان کردہ مفاہیم قرآن کو قطعی و حتمی سمجھنا خود ایمان بالقرآن کا لازمی تقاضا بھی ہے اور تفسیر قرآن کا صحیح طریقہ بھی۔

(۲) تفسیر قرآن اور صحابہ کرام j کے آثار واقوال

قرآن مجید کی درست تفسیر اور صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام j کے اقوال و آثار سے رہنمائی بھی ازبس ضروری ہے۔ اس کی بنیادی طور پر دو وجوہات ہیں:

پہلی یہ کہ قرآن مجید صحابہ کرامؓ کے سامنے نازل ہوتا تھا اور خود انہی کے احوال وظروف کے مطابق اُترتا تھا' اس لیے وہ اس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ اور واقف تھے اور اس کے مفاہیم ومعانی کو صحیح طور پر سمجھتے تھے۔ لہٰذا آیاتِ قرآنی کے جو مطالب صحابہ کرامؓ نے بیان فرمائے ہیں ان کو تسلیم کرنا لازم ہے' کیونکہ کسی بھی کلام کے پس منظر سے آگاہی اس کے حصولِ فہم کا بنیادی ترین اصول ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

وحینئذ اذا لم نجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة رجعنا فی ذلک الی اقوال الصحابة فانهم ادری بذلک لما شاهدوه من القرآن والاحوال التی اختصوا بها ومالهم من الفهم التام والعلم الصحیح والعمل الصالح(۸)

''جب ہمیں کسی آیت کی تفسیر قرآن یا صحیح روایت سے معلوم نہ ہو سکے تو پھر ہمیں صحابہ کرامؓ کے اقوال پر غور کرنا چاہیے' کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ فلاں آیت کس موقع پر اور کیوں نازل ہوئی۔ مزید برآں وہ مکمل فہم' صحیح علم اور نیک اعمال جیسے خصائص کے حامل تھے۔''

یہی بات رأس المفسرین علامہ ابن کثیرؒ نے کہی ہے کہ:

''صحابہ کرامؓ اُس وقت کے قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے' ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم' علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا''۔(۹)

دوسری یہ کہ قرآن مجید درحقیقت صحابہ کرام j کی زبان میں نازل ہوا اور وہی اس کے اوّلین مخاطب تھے۔ بنا بریں یہ قرآن مجید کے عربی مبین اور فصیح و بلیغ ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس

◀◀ سامنے رہے تو یہ بالکل درست ہے کہ الفاظ قرآن بسا اوقات ایک سے زائد احتمالات کے حامل ہوتے ہیں' تو وہاں سنت مرادِ الٰہی کا تعین کر دیتی ہے' جیسے ''قَرْءٌ''۔ اس کے معنی حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی۔ اب سنت نے فیصلہ کر دیا کہ یہاں حیض مراد ہے۔ بعض لوگ اس قول کی آڑ میں علمائے سلفؒ کو مطعون ٹھہراتے ہیں کہ وہ روایات کو قرآن پر ترجیح دیتے تھے' حالانکہ حجت ہونے کے اعتبار سے سنت (بشرطِ ثبوت وصحت) اور قرآن میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں' بلکہ دونوں کا ایک ہی مقام ومرتبہ ہے کیونکہ دونوں ہی وحی ہیں' البتہ الفاظِ الٰہی ہونے کی بنا پر قرآن کو خصوصی شرف وفضیلت حاصل ہے۔ (مضمون نگار)

کے مقصود و منشاء کو درست طور پر سمجھ لیتے۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے کما حقہ سمجھا۔ لہٰذا تفسیر قرآن میں ان کے بیان کردہ معانی کو قبول کرنا واجب اور ان کی خلاف ورزی کرنا صریح ضلالت ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ ملحوظِ نظر رہنا چاہیے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں اگر صحابیؓ کا قول ذاتی اجتہاد و استنباط پر مبنی ہے اور اس سے نزول آیت کا پس منظر یا کسی لفظ کی لغوی وضاحت پر مقصود نہیں تو اس صورت میں اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، خصوصاً جب دیگر صحابہؓ کا اس سے اختلاف بھی منقول ہو۔ واللہ اعلم!

(۳) تفسیر قرآن میں شانِ نزول کی اہمیت

شانِ نزول یا اسبابِ نزول سے مراد یہ ہے کہ ان اسباب و وجوہ کا علم ہو جو قرآنی آیات کے نزول کا باعث بنیں، یعنی زمانۂ نزول قرآن کا پس منظر معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر ظاہر ہے کہ الفاظ قرآن کا صحیح مدعا سمجھنا بہت مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے اور آیت کے اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

معرفة سبب النزول تعين على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبب(۱۰)

''سبب نزول کی معرفت آیت کے سمجھنے میں معاون ہے، کیونکہ سبب کا علم مسبب تک پہنچا دیتا ہے''۔

اسبابِ نزول کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اسباب نزول کے سلسلہ میں افراط و تفریط کا رویہ پایا جاتا ہے۔ بعض اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں تو بعض تفسیر قرآن کے لیے اسے لازم قرار دیتے ہیں۔ اس کی صحیح حیثیت جاننے کے لیے معلوم ہونا چاہیے کہ اسباب نزول کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جس کی طرف خود آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً مغازی یا دیگر واقعات، کہ جب تک ان کی تفصیل سامنے نہ ہو مذکورہ جزئیات ذہن نشین نہیں ہو سکتیں۔ اس کا جاننا تو ہر مفسر کے لیے ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء نے جو یہ کہا کہ اسبابِ نزول کی معرفت کے بغیر قرآن کی تفسیر نہیں ہو سکتی، اس سے مراد یہی قسم ہے۔

چنانچہ اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ کسی نے شانِ نزول کو مدنظر رکھے بغیر آیت کی غلط تفسیر بیان کر دی تو صحابہؓ نے اس کی تصحیح کی۔ بطورِ مثال ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

اسلامی لشکر رومیوں کی ایک عظیم الشان فوج سے معرکہ آراء تھا کہ ایک مجاہد نے تن تنہا رومی لشکر پر حملہ کر دیا اور ان کی صفوں میں گھس گیا۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ اس نے تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا، جبکہ قرآن میں ہے کہ ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵) یعنی ''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔ صحابیٔ رسول سیدنا ابوایوب انصاریؓ کو علم ہوا تو فرمایا کہ اس آیت کا یہ مفہوم درست نہیں، بلکہ یہ آیت تو ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب اسلام کو شان و شوکت حاصل ہو گئی اور یہ

مضبوط ہوگیا تو ہم نے سوچا کہ اب ہماری مدد کی خاص ضرورت نہیں رہی' لہٰذا جہاد میں مصروفیت کی بنا پر ہمارے کاروبار اور جائیداد کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کریں اور جہاد چھوڑ دیں' تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جہاد کو چھوڑ کر کاروبارِ زندگی میں مشغول ہوجانا ہلاکت ہے' اس سے بچو۔(۱۱)

اس قسم کا سبب نزول اگر صحابیؓ سے مروی ہو تو اس کو مرفوع حدیث سمجھا جائے گا' کیونکہ اس میں صحابہ کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا۔ امام حاکمؒ لکھتے ہیں:

واذا اخبر الصحابی الّذی یشهد الّذی شهد الوحی والتنزیل عن آیة من القرآن انها نزلت فی کذا' فانه حدیث مسند ومشی علی هذا ابن الصلاح(۱۲)

''جب کوئی صحابی جو نزولِ وحی یا آیت کے وقت موجود تھا' قرآن کی کسی آیت کے بارے میں خبر دے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تو یہ بھی حدیث مرفوع ہے۔ ابن الصلاحؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے''۔

سبب نزول کی دوسری قسم یہ ہے کہ صحابہؓ یا تابعینؒ کسی آیت کے تحت یہ کہیں کہ **نزلت فی کذا** یا **انزل اللّٰه فی کذا**' یعنی یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی۔ اس قسم کے بارے میں حجۃ الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

وقد ذکر المفسرون تلک الحادثة بقصد الاحاطة بالآثار المناسبة للآیة او بقصد بیان ما صدق علیه المعصوم ولیس هذا القسم من الضروریات ..... وکان غرضهم تصویر ما صدقت علیه الآیة(۱۳)

''بسا اوقات مفسرین آیت کے تحت کوئی واقعہ اس مقصد سے ذکر کر دیتے ہیں کہ اس آیت سے مناسبت رکھنے والے واقعات جمع ہوجائیں' یا جس امر کا عموم تصدیق کر رہا ہو اُس کی وضاحت مقصود ہوتی ہے۔ یہ قسم ضروری اسبابِ نزول سے نہیں ہے..... اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی تصویر کشی کرنا ہوتا ہے جس پر آیت صادق آسکتی ہے''۔

بہرحال شانِ نزول کی یہ قسم بنیادی اہمیت کی حامل نہیں۔ سلف دراصل یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ واقعہ یا مسئلہ بھی اس آیت کے تحت داخل ہے' ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں' لیکن یہ فائدے سے بھی خالی نہیں' لہٰذا اس کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں معتدل رویہ یہ ہے کہ ایسی روایات کی سند کی مکمل تحقیق اور چھان بین کے بعد ہی انہیں قبول کرنا چاہیے۔ نہ تو بالکل نظر انداز کرنا مناسب ہے اور نہ ہی ضعیف و بے سند روایات کی بنا پر ہر آیت یا ہر سورت کا شانِ نزول بیان کرنا علمی طریق ہے۔

ایک اور پہلو جس کا ذکر اسبابِ نزول کے ضمن میں ضروری ہے' یہ ہے کہ آیت کے کسی خاص سبب نزول کے ہونے کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ اس آیت کا حکم اس واقعہ یا شخص سے خاص ہے' بلکہ جہاں بھی وہ نوعیت پائی جائے گی اسی حکم کا اعتبار ہوگا۔ اصول تفسیر کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ ''**العبرة بعموم اللفظ لا**

بخصوص السبب'' یعنی ''اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ سبب کے خصوص کا۔'' شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

قصرعمومات القرآن علی اسباب نزولها باطل فان عامة الآیات نزلت باسباب اقتضت ذلک وقد علم ان شیئا منها لم یقصر علی سببه[۱۴]

''عموم قرآن کو اسبابِ نزول پر محدود کر دینا باطل ہے' کیونکہ اکثر آیات ایسے اسباب کے تحت نازل ہوئی ہیں جو اس کے مقتضی تھے' جبکہ یہ معلوم ہے کہ کوئی آیت بھی اپنے سبب نزول تک محدود نہیں ہے''۔

(۴) تفسیر قرآن میں کتب سابقہ اور اسرائیلیات کا مقام

قرآن مجید میں پہلی اُمتوں بالخصوص بنی اسرائیل کا مختلف پہلوؤں سے ذکر کیا گیا ہے' اور ان کے تذکرے سے جو اصل مقصود ہے (یعنی تذکیر و نصیحت اور عبرت پذیری) وہ آیاتِ قرآنی سے بخوبی حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم بہت سے واقعات کی تفصیلات و جزئیات تورات و انجیل اور اسرائیلی روایات سے حاصل ہو جاتی ہیں جن سے کئی مفید نکات حاصل ہوتے ہیں اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

تورات اور انجیل میں اگرچہ بہت زیادہ تغیرات ہو چکے ہیں اور ان کے ماننے والوں نے اس میں تحریف و تبدل کر دیا ہے' لیکن قرآن مجید اور سنت رسول کے بیان کردہ حقائق کو حتمی خیال کرتے ہوئے ایسی جزئیات جو کتاب و سنت سے متصادم نہ ہوں' تورات و انجیل سے لی جا سکتی ہیں۔ یہی معاملہ ''اسرائیلیات'' کا ہے۔ ان سے مراد وہ روایات ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والے صحابہؓ یا تابعینؒ سے مروی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے لیکن ان کی تصدیق یا تکذیب سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اِذَا حَدَّثَکُمْ اَهْلُ الْکِتَابِ فَلَا تُصَدِّقُوْهُمْ وَلَا تُکَذِّبُوْهُمْ))[۱۵]

''جب تمہیں اہل کتاب کوئی واقعہ ذکر کریں تو اس کی تصدیق نہ کرو اور نہ اس کو جھٹلاؤ''۔

یہ اس لیے فرمایا کہ مبادا وہ تمہیں سچی خبر دے رہے ہوں تو تم ان کو جھٹلا دو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں غلط خبر دے رہے ہوں اور تم ان کی تصدیق کر بیٹھو۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب قرآن و سنت اس معاملے میں خاموش ہوں اور اس کی صریح تصدیق یا تردید موجود نہ ہو۔

اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے صحابہ کرامؓ میں سے سیدنا ابو ہریرہؓ' سیدنا ابن عباس اور سیدنا عبداللہ ابن عمرو بن عاص j نے اہل کتاب کی روایات لی ہیں۔[۱۶] لیکن زمانۂ تابعین میں اس معاملے میں کوتاہی ہوئی اور اسرائیلیات کے نام پر ہر قسم کا رطب و یابس جمع ہو گیا جو آج تک کتب تفسیر میں موجود ہے اور بعض متساہل مفسرین اس کو بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ایک غیر مناسب رجحان ہے جس سے

احتراز ضروری ہے۔ بلکہ بعض روایات تو ایسی ہیں جن سے انبیاء کرام f کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی قسم کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ النقل عن بنی اسرائیل دسیسة دخلت فی دیننا.....(۱۷)

''بنی اسرائیل سے روایت کرنا ایسا پوشیدہ فریب ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو چکا ہے.....''

بعض لوگ اسرائیلی روایات پر تو شدید تنقید کرتے ہیں' لیکن کتب سابقہ (تورات وانجیل وغیرہ) سے ایسی چیزوں کو حلال کرنے کی سعی میں مصروف ہیں جو اسلامی احکامات کی روشنی میں قطعاً حرام ہیں' اور شرائع سابقہ کی روشنی میں کتاب وسنت کی نصوص کی ایسی تشریحات کر رہے ہیں جو اُمت مسلمہ کے اجتماعی تعامل سے قطعی بیگانہ اور بالکل برعکس ہیں۔ تماثیل اور موسیقی کی حلت کے لیے پہلی شریعتوں کے حوالے اسی رویے کی عکاسی کرتے ہیں' باوجودیکہ یہ ملت اسلامیہ کا اجماعی موقف ہے کہ ہماری شریعت نے سابقہ شرائع کی بے شمار حلال چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔

(۵) تفسیر قرآن میں عربی لغت وادب کا مقام

کسی بھی متکلم کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کی زبان سے گہری واقفیت حاصل ہونا ایسا مسلّمہ اُصول ہے جس سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا قرآن مجید کے مفہوم ومدعا تک رسائی کے لیے عربی زبان وادب سے شناسائی از بس ضروری ہے' اور عربی زبان وادب کا علم ہونا ایک مفسر کے لیے ناگزیر ہے۔

صحابہ کرام j بھی قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل عرب کی لغت اور ان کے محاورات سے مدد لیا کرتے تھے۔ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

الشعر دیوان العرب فاذا لعاجم علینا شیءٌ من القرآن رجعنا الیه (الاتقان)

''شعر اہل عرب کا دیوان ہے' جب ہمیں کوئی لفظ اجنبی معلوم ہوتا تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے۔''

اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لغتِ عرب کا علم فہم قرآن میں معاون ہے' وہیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ اس ضمن میں وہی لغت معتبر ہوگی جو زمانۂ نزولِ قرآن میں رائج تھی نہ کہ بعد میں بولی جانے والی عربی زبان' جس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ لغت سے الفاظِ قرآن کا مفہوم متعین کرنا اسی صورت میں درست سمجھا جائے گا جب وہ احادیثِ رسولؐ' اقوال صحابہؓ اور سلف صالحینؒ کے طے کردہ متفقہ اور اجماعی مفہوم کے مخالف نہ ہو۔ افسوس ہے کہ اس معاملے میں بھی افراط وتفریط کے پہلو موجود ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو محض تراجم پڑھ کر قرآن کی تفسیر کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے جبکہ دوسری طرف لغت وادب ہی کو تفسیر قرآن کا اصل مصدر وماخذ سمجھا جاتا ہے اور لغت عرب یا ادب جاہلی کی بنا پر سمجھے گئے مفہوم کو حدیث وسنت کے مقابلے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ جو مفہوم اپنی خود ساختہ ''لغات القرآن'' سے ثابت ہو جائے وہی مقصودِ قرآن قرار پاتا ہے اور اس ہستی کے ارشادات وفرامین کو ''روایات'' کہہ کر

نظرانداز کر دیا جاتا ہے جس کے قلبِ اطہر پر قرآن نازل ہوا تھا۔ کچھ لوگ جاہلی شعراء کے کلام سے اخذ کردہ مفاہیم کو اتنا قطعی سمجھتے ہیں کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ اُمت کے تمام اہل علم اس کے برعکس موقف رکھتے ہیں' اپنے دریافت شدہ مطالب ہی کو درست قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل قطعی غلط اور تعبیر کلام کے مسلّمہ اصولوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے' اس لیے کہ جب خود متکلم اپنی بات کا کوئی مفہوم متعین کر دے تو اس کی خلاف ورزی کسی صورت میں نہیں کی جا سکتی۔ دیگر ماخذوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے لغت و ادب پر زیادہ زور دراصل اہل بدعت نے دیا ہے' تاکہ اپنے خودساختہ نظریات کو قرآن سے کشید کیا جا سکے' ورنہ یہ کوئی ایسا مرجع نہیں کہ محض اسی پر اعتماد کرتے ہوئے کسی آیت کا درست مفہوم متعین کیا جا سکے۔ البتہ مفرد الفاظ کے سلسلے میں لغت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ امام المفسرین علامہ ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

> ''مفرداتِ قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لیے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے' مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے بہرحال وحیٔ الٰہی اور سنت کی طرف رجوع کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔'' (۱۸)

اگر محض لغت کی بنا پر قرآن مجید کو سمجھنا ممکن ہوتا تو کم از کم صحابہ کرام j کو اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی اور وہ رسول اکرم ﷺ کی طرف رجوع نہ کرتے۔ ایسی بہت سی مرویات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بسا اوقات آیاتِ قرآنی کا صحیح منشا سمجھ نہ پاتے اور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر استفسار کرتے۔ بطور مثال ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود h فرماتے ہیں کہ جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ۝﴾ تو صحابہؓ پر بہت گراں گزری (کیونکہ انہوں نے ظلم کو اس کے عام معنی معصیت یا زیادتی پر محمول کیا) تو رسول معظم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کبھی ظلم نہ کیا ہو؟ آپؐ نے انہیں سمجھایا کہ یہاں ظلم کا لفظ اپنے خاص مفہوم یعنی شرک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان میں آیا ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بیٹا کبھی شرک نہ کرنا' کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝﴾ (لقمٰن) (۱۹)

یہی وجہ ہے کہ لغت و محاورات سے استفادہ کرنے والے اور لغوی تشریحات کے لیے شواہد تک کو چھان مارنے والے معتزلہ نے بھی عقل پرست ہونے کے باوجود اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوالِ صحابہؓ سے مدد لی ہے' جیسا کہ علامہ زمخشری معتزلی کی تفسیر ''الکشاف'' میں یہ انداز انتہائی نمایاں نظر آتا ہے۔

المختصر نہ تو عربی زبان سے نابلد رہ کر کسی کو قرآن کی تفسیر کرنے کا حق ہے اور نہ ہی لغت عرب اور

ادب جاہلی سے حاصل شدہ معانی کو احادیثِ رسولؐ آثارِ صحابہؓ اور اسلاف کے متفقہ فہم پر ترجیح دی جاسکتی ہے' بلکہ معاملہ اس کے بین بین ہے۔

(۶) تفسیر بالرائے

الفاظِ قرآن سے خدا تعالیٰ کی حقیقی مراد کیا ہے' اس باب میں قطعیت کا درجہ مخلوق میں سے صرف اور صرف ارشاداتِ پیغمبر معصوم ﷺ کو حاصل ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی تفسیر (اگر مبنی بر اجتہاد نہ ہو) ہے جو کہ حدیث ہی میں داخل ہے اور پھر آیاتِ قرآنی کا وہ متفقہ مفہوم جس پر سلف سے خلف تک سب کا اجماع ہے' کیونکہ از روئے حدیث اُمت بھی بحیثیت مجموعی خطا پر جمع نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی شے کو یقینی ہونے کا شرف حاصل نہیں۔ اور بنظر غائر دیکھا جائے تو قرآن مجید کا اصل مقصود و مدعا اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے اور اُمت مسلمہ کے پاس محفوظ شکل میں موجود ہے۔ لیکن فطرتِ انسانی میں تحقیق و اکتشاف اور انکشاف و جستجو کا جذبہ اسے ہر لحظہ نئے نئے پہلوؤں اور متنوع جہات کے بارے میں غور و فکر پر ابھارتا رہتا ہے۔ یہی معاملہ کلامِ الٰہی پر تدبر و تفکر کے معاملے میں پیش آتا ہے۔ تو کیا تفسیری منقولات پر اکتفا کرتے ہوئے انسان اپنے اس فطری جذبے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی قسم کا نظریہ و تصور پیش نہ کرے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے' کیونکہ اسلام انسان کے تمام تر فطری داعیات کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے اور انہیں صحیح رُخ عطا کرتا ہے۔ چنانچہ اگر قرآنِ مجید میں غور و فکر سے کسی پر حکمت کے در کھلتے' الجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں سلجھتی اور معانی کے کسی نئے جہان تک رسائی ہوتی ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں کہ ''اس سے علماء کبھی سیراب نہ ہوں گے.....اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے''۔ (۲۰)

پس قرآن مجید میں تفکر و تدبر کے ذریعے مفاہیم و مطالب کے نئے رُخ تلاش کرنا' قرآن اور آیاتِ قرآنی سے نئے نئے پہلو اُجاگر کرنا تفسیر بالرائے کہلاتا ہے۔ یعنی اس کی بنیاد نقل و روایت پر نہ ہو بلکہ استنباط و اجتہاد پر ہو' لیکن ہر قسم کی تفسیر بالرائے قابل قبول نہیں' بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے۔

☆ اگر تو تفسیر قرآن کی مناسب استعداد اور پختہ علم کے ساتھ سلف صالحینؒ کے طریق پر کاربند رہتے ہوئے قرآن مجید سے اکتسابِ فیض کیا جائے اور اس سے نئے عقدے کھولے جائیں تو یہ امر مستحسن ہوگا اور اسے **تفسیر بالرأی المحمود** کہیں گے۔

☆ لیکن اگر اس کے برعکس بغیر ضروری استعداد حاصل کیے اور منہج سلف سے روگردانی کرتے ہوئے اپنی خواہشات یا ذاتی افکار و نظریات کی روشنی میں کوئی نیا تصور یا فکر برآمد کر لی جائے تو یہ طرزِ عمل قابل مذمت ہے اور اسی کو **تفسیر بالرأی المذموم** کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں رسول معظم ﷺ نے سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ))(۲۱)

''جو قرآن مجید کے بارے میں اپنی رائے سے کوئی بات کہتا ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔''

یہی وعید اُس شخص کے بارے میں بھی ہے جو بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے۔(۲۲) حدیث کے مطابق تو ایسا شخص بھی غلطی کا مرتکب ہے جو محض رائے سے قرآن میں کچھ کہے' خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔(۲۳) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

فاما تفسير القرآن بمجرد الرأى فحرام(۲٤)

''محض رائے سے من گھڑت تفسیر کرنا حرام ہے''۔

شیخ الاسلامؒ نے اپنے ''مقدمہ اصول التفسیر'' میں صحابہؓ وسلفؒ سے درجن سے زائد روایات نقل کی ہیں کہ وہ تفسیر بالرائے کو ناپسند سمجھتے تھے اور تفسیر کے سلسلہ میں انتہائی محتاط رویہ اپناتے تھے۔ان میں سے چند اقوال درج ذیل ہیں:

☆ شعبہؒ کی روایت ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق h نے فرمایا: ''کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر کتاب اللہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں؟''

☆ ابن جریرؒ سے مروی ہے کہ ''سیدنا ابن عباس i سے ایک ایسی آیت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اگر تم میں سے کسی سے کیا جاتا تو ضرور جواب دیتا' مگر ابن عباسؓ نے کچھ کہنے سے صاف انکار کر دیا''۔

☆ یزید بن ابی یزیدؒ کہتے ہیں کہ ''ہم سعید بن میبّبؒ (عظیم تابعی) سے حلال وحرام کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے' اس چیز کا انہیں سب سے زیادہ علم تھا' لیکن جب ہم کسی آیت کی تفسیر دریافت کرتے تو اس طرح چپ ہو جاتے گویا سنا ہی نہیں''۔

☆ ابراہیمؒ کہتے ہیں: ''ہمارے اساتذہ تفسیر کرنے سے بچتے اور ڈرتے تھے''۔

☆ سیدنا مسروقؒ فرمایا کرتے تھے: ''تفسیر کرنے سے بچو اور ڈرو' کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے روایت ہے''۔(۲۵)

یہ تھا ہمارے اسلافؒ کا طریقہ کار! لیکن اس کے برعکس آج دیکھئے کہ ہر شخص ''مفکر قرآن'' کے منصب پر فائز نظر آتا ہے اور اپنی خود ساختہ ''لغات القرآن'' کی روشنی میں اپنے من پسند افکار وآراء کو قرآن سے کشید کر کے اسے مرادِ الٰہی باور کرا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے قرآن میں تدبر کے اپنے خود ساختہ اصول مقرر کر رکھے ہیں' جن میں احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ تو ظنیت کے درجے میں ہیں' لیکن ادب جاہلی اور ذاتی ایجاد شدہ نظم قرآن مرتبۂ قطعیت پر فائز ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ان اصولوں کی روشنی میں قرآنی آیات کے ایسے مطالب پیش کیے جا رہے ہیں جو ڈیڑھ ہزار برس سے ملت اسلامیہ میں بلا اختلاف ونزاع متفقہ اور مسلّمہ طور پر رائج عقائد واعمال سے صریحاً متصادم ہیں۔ یہ ساری کاوشیں

دراصل ''تفسیر بالرأی المذموم'' میں داخل ہیں۔ بالکل سچ فرمایا تھا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے کہ ''جو بھی سلف کے طریق سے ہٹ کر تفسیر کرتا ہے وہ گویا بدعات کا دروازہ کھولتا ہے''۔(۲۶)

تفسیر آیاتُ الاحکام: ایک تعارف

آیات الاحکام اوران کی تفسیر کے سلسلے میں چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

(۱) 'آیات الاحکام' سے مراد

عمومی طور پر ''آیات الاحکام'' میں وہ تمام آیات شامل ہیں جو شرعی احکام بیان کرتی ہیں یا ان پر دلالت کرتی ہیں' خواہ وہ احکام عقائد سے متعلق ہوں یا عملی وفرعی معاملات ☆ سے' اور چاہے ان کا تعلق اخلاقیات وروحانیات سے ہو۔ لیکن اہل علم نے احکام القرآن کا اطلاق صرف عملی وفرعی یعنی فقہی احکام پر کیا ہے۔ چنانچہ جب مطلق طور پر ''آیات الاحکام'' کہا جائے تو اس سے مراد ہوں گی: ''وہ آیات جو احکامِ فقہیہ کو بیان کرتی ہیں اور از روئے نص یا استنباط ان پر دلالت کرتی ہیں''۔(۲۷)

''تفسیر آیات الاحکام'' یا ''فقہی تفسیر'' وہ کہلاتی ہے جس میں:

☆ اصول وفروع میں احکامِ شرعیہ کی تقسیم سے مراد دو امور لیے جاتے ہیں' جن میں سے ایک تو درست ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن دوسرا غلط ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

قابل قبول تقسیم یہ ہے کہ غلبہ کے اعتبار سے یا توضیح وتشریح کے لیے معاملات کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے کہ یہ اصولی مسائل ہیں اور یہ فرعی۔ یہ تقسیم کوئی زیادہ دقیق یا منضبط نہیں' کیونکہ یہ ضروری ہے کہ اعتقادی مسائل پر عمل کی بنیاد رکھی جائے اور وسیع تر مفہوم میں اخلاق وسلوک کے معاملات اسی میں شامل ہیں۔ دوسری طرف عملی' فقہی اور فرعی مسائل بھی کسی ارادہ' نیت یا عقیدہ ہی کی بنیاد پر سرزد ہوتے ہیں۔ گویا ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ کئی ایسے مسائل ہیں جنہیں ''اصول'' میں شمار کیا جاتا ہے' لیکن ایک مسلمان کے لیے ان سے ناواقف رہنا عذر شمار ہوتا ہے' بلکہ ان کو سیکھنا واجب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جبکہ کچھ معاملات جو شامل تو ''فروع'' میں ہوتے ہیں لیکن وہ ضروریاتِ دین میں شمار ہوتے ہیں اور ہر مسلمان پر حتمی طور پر فرض ولازم ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز' روزہ اور زکوٰۃ جیسے فرائض۔ المختصر اس پہلو سے یہ ایک اصطلاحی تقسیم ہے اور قاعدہ ہے کہ ''**لامشاحة فی الاصطلاح**'' یعنی ''اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں جب تک خرابی کا ڈر نہ ہو''۔ اور یہاں ایسا کوئی اندیشہ نہیں۔

جہاں تک دوسری تقسیم کا تعلق ہے' جو کہ قابل ردّ ہے' وہ یہ ہے کہ فرعی مسائل کو ہلکا سمجھا جائے یا تکفیر اور بدعتی قرار دینے میں اس کا اعتبار کیا جائے کہ جس نے مسائل اصول میں غلطی کی وہ کافر یا بدعتی ہے' لیکن فرعی مسائل میں ایسا نہیں' تو یہ بات غلط ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ دیکھئے: (ا) الثبات والشمول' ص ٦١۔ (ب) التفریق بین الاصول والفروع' للشتری' ١٩٦ /١۔ (ج) منهج القرآن فی تقریر الاحکام' ص ٧٤۔١٣٢۔

''فقہی احکام کو بیان اوران پر تنبیہ کرنے کا التزام کیا گیا ہو' خواہ اس میں صرف اسی پر اکتفا کیا گیا ہو یا (دیگر آیات کے ساتھ) احکام فقہیہ پر خصوصی توجہ دی گئی ہو''۔(۲۸)

حاصل یہ کہ ''تفسیر آیات الاحکام'' میں عقیدہ' تاریخ یا دیگر موضوعات سے متعلقہ آیات کے بجائے صرف فقہی احکام پر مشتمل قرآنی آیات کی تفسیر کی جاتی ہے۔

(۲) ''آیات الاحکام'' کی تعداد

یہ نکتہ علماء کے مابین اختلافی ہے کہ آیا ''آیات الاحکام'' ایک خاص عدد تک محدود ہیں یا نہیں۔اس سلسلے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

☆ **پہلا قول** : پہلا موقف یہ ہے کہ احکام سے متعلقہ آیات محدود ہیں اور ایک عدد معین میں محصور ہیں۔(۲۹) پھر اس قول کے قائلین کا ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ یہ پانچ سو ہیں اور کچھ کے نزدیک ان کی تعداد دو صد ہے۔علامہ نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں:

وقد قیل انها خمس مائة آیة ' وما صح ذلک ' وانما هی مائتا آیة او قریب من ذلک وان عدلنا عنه وجعلنا الآیة کل جملة مفیدة یصح ان تسمی کلامًا فی عرف النحاة ' کانت اکثر من خمس مائة آیة(۳۰)

''یہ بھی کہا گیا ہے کہ احکام کی آیتیں پانچ سو ہیں' لیکن یہ درست نہیں' ان کی تعداد دو سو یا اس کے قریب ہے۔اگر ہم اس سے تجاوز کرتے ہوئے ہر اُس مفید جملے کو آیت قرار دیں جسے اہل نحو کی اصطلاح میں ''کلام'' کہا جاتا ہے تو یہ پانچ سو سے زیادہ ہو جائیں گی''۔

حضرت نواب صاحبؒ کے نزدیک یہی درست ہے' اسی لیے مندرجہ بالا عبارت کے بعد لکھا ہے:

وهذا القرآن من شک فیه فلیعد ''اور یہ قرآن ہے' جسے شک ہو وہ شمار کر لے''۔

بعض نے یہ تعداد ڈیڑھ صد بتائی ہے۔

☆**دوسرا قول** :''آیات الاحکام'' کے عدد کے بارے میں دوسرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص عدد میں محدود نہیں ہیں اور قرآن مجید کی ہر آیت سے ایک حکم مستنبط ہوتا ہے۔یہ ملکہ اسے حاصل ہوتا ہے جس پر خدا تعالیٰ قرآن مجید کے مفاہیم ومطالب کے دروازے کھول دے' جو صفائے روح میں ممتاز ہو اور قوتِ استنباط' جودتِ ذہن اور فہم رسا کی خوبیوں سے مالا مال ہو۔(۳۱)

اکثر اہل علم نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ان میں عز بن عبدالسلام' قرافی' طوفی' زرکشی' ابن جزی' سیوطی' ابن النجار' شوکانی اور شنقیطی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر علماء شامل ہیں۔(۳۲)

علامہ نجم الدین الطّوفی اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

والصحیح ان هذا التقدیر غیر معتبر ' وان مقدار ادلة الاحکام فی ذلک غیر

منحصر ، فان احکام الشرع کما تستنبط من الاوامر والنواھی ، کذلک تستنبط من الاقاصیص والمواعیظ ونحوھا، فقل آیة فی القرآن الکریم الا ویستنبط منھا شیء من الاحکام، واذا اردت تحقیق ھذا فانظر الی کتاب 'ادلة الاحکام(۳۳) **للشیخ عز الدین بن عبدالسلام، وکأن ھؤلاء الذین حصروھا فی خمس مائةآیة انما نظروا الی ما قصد عن بیان الحکم دون ما استفید منه، ولم یقصد به بیانھا**(۳٤)

''صحیح بات یہ ہے کہ یہ حد بندی قابل اعتبار نہیں اور ادلۃ الاحکام کی مقدار اسی عدد تک محدود نہیں۔ اس لیے کہ احکام شریعت جس طرح اوامر ونواہی سے مستنبط کیے جاتے ہیں اسی طرح قصص ومواعظ سے بھی ان کا استنباط ہوتا ہے۔ قرآن کی بہت ہی تھوڑی آیتیں ہوں گی جن سے کوئی حکم مستنبط نہ ہوتا ہو۔ اگر اس مسئلہ کی مزید تحقیق مقصود ہو تو علامہ عز الدین بن عبدالسلام کی کتاب ''**ادلة الاحکام**'' کی طرف رجوع کیجیے۔ گویا جن علماء نے آیاتِ احکام کو پانچ سو تک محدود کیا انہوں نے اس میں بیانِ حکم کے سلسلے میں یہ دیکھنے کے بجائے کہ آیت سے کیا مستفید ہوتا ہے، صرف اس چیز پر نظر رکھی جو اس میں بیان حکم کے سلسلہ میں مقصود تھی، حالانکہ وہ مقصود نہیں تھی''۔

اسی نکتے کی توضیح میں علامہ قرافیؒ فرماتے ہیں:

فلا تکاد تجد آیة الا وفیھا حکم، وحصرھا فی خمس مائة آیة بعید(۳۵)

''آپ کو کوئی ایسی آیت نہ ملے گی جس میں کوئی حکم نہ ہو اور آیاتِ احکام کو پانچ صد تک محدود کر دینا امر بعید ہے''۔

اس موقف کی ترجیح پر استدلال یوں کیا گیا ہے کہ:

''قرآن مجید میں احکام کی دو قسمیں ہیں''۔ (۳٦) ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے اور یہ بہت ہیں، جیسے: ﴿کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ﴾ (البقرة:۱۸۳)۔ احکام القرآن عمومی طور پر اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً سورۃ البقرۃ، النساء اور المائدۃ کے غالب احکام اسی نوعیت کے ہیں۔ قرآنی احکام کی دوسری قسم وہ ہے جو غور وفکر اور استنباط سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ احکام پھر مزید دو قسموں میں منقسم ہیں:

(**۱**) وہ احکام جو ایک آیت سے براہِ راست، بغیر کسی دوسری آیت ملائے اخذ کر لیے جاتے ہیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ''حرمت استمنا'' کا حکم مستنبط کیا گیا ہے:

﴿وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ لِفُرُوۡجِھِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۞ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِھِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُھُمۡ فَاِنَّھُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۞ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡعٰدُوۡنَ﴾ (المؤمنون)

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا اپنی کنیزوں سے جو اُن کی

ملکیت میں ہیں' کیونکہ ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پس جو اس کے سوا کچھ اور چاہے سو یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اسی طرح آیت مبارکہ:

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''سو اب ان سے مباشرت کیا کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اسے طلب کیا کرو' اور کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ تمہارے لیے فجر کے وقت سفید دھاری سیاہ دھاری سے صاف ظاہر ہو جائے۔''

سے یہ مسئلہ اخذ کرنا کہ اگر حالت جنابت میں روزہ رکھ لیا اور طلوع فجر کے بعد غسل کر لیا تو روزہ درست ہوگا۔

(۲) استدلال کے طریق سے ماخوذ احکام کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی آیت کو دوسری آیت یا حدیث سے ملا کر اس سے کسی حکم کا استنباط کیا جائے۔ جیسا کہ سیدنا علی[۳۷] اور سیدنا ابن عباس j[۳۸] نے قرآن سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے کہ:

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف:۱۵)

''اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہیں۔''

اور دوسرے مقام پر ہے کہ:

﴿وَفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾(لقمٰن:۱۴) ''اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سال میں''۔

حمل اور دودھ چھڑانے کی کل مدت تیس ماہ ہیں' اگر ان میں سے دودھ چھڑانے کے دو سال منہا کر دیے جائیں تو باقی چھ ماہ بنتے ہیں اور یہی حمل کی کم از کم مدت قرار پاتی ہے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲) اور ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾(المائدۃ:۶) میں تطہر یعنی پاکیزگی حاصل کرنے سے مراد غسل ہے' اور یہ نتیجہ سورۃ النساء کی اس آیت سے نکالا گیا ہیکہ ﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ (النساء:۴۳)۔

حاصل بحث اور دونوں اقوال میں تطبیق

احکام کی آیات کے عدد کے بارے میں مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک ان کی تعداد متعین نہیں' بلکہ تمام آیات سے احکام مستنبط ہوتے ہیں' جبکہ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ ایسی آیات ایک مخصوص عدد میں محصور ہیں۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ اختلاف تضاد کے بجائے تنوع پر مبنی نظر آتا ہے۔ اگر اس کی یہ توجیہہ کر لی جائے کہ جن علماء نے ''آیاتِ احکام'' کو باقاعدہ شمار کیا ہے اس سے ان کی مراد صرف وہی آیات ہوں جن میں صراحت سے 'احکام' کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دوسرے نقطۂ نظر کو اس امر پر محمول کیا جائے کہ دیگر

آیات سے بھی احکام اخذ کیے جا سکتے ہیں' لہٰذا اس اعتبار سے ان کی تعداد متعین نہیں۔ علامہ زرکشی نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے' لکھتے ہیں:

ولعل مرادهم المصرح به فان آيات القصص والامثال وغيرها يستنبط فيها كثير من الاحكام (۳۹)

''شاید ان علماء کی مراد وہ آیات ہوں جن میں احکام کی تصریح موجود ہے' اس لیے کہ قصص اور امثال پر مبنی آیات سے بھی بہت سے احکام کا استنباط ہوتا ہے''۔

تفسیر آیات الاحکام کا ارتقاء

عہد نبویؐ

تفسیر فقہی کا آغاز صدرِ اسلام ہی سے ہو گیا تھا اور یہ قرآن مجید کی نبوی تفسیر ہی کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر جب قرآنی آیات نازل ہوتیں تو آپؐ ان کی وضاحت فرماتے۔ احکام کی آیتیں بھی انہی میں شامل تھیں۔ رسول اکرم ﷺ ان کی تشریح وتوضیح اپنے قول سے بھی فرماتے اور عمل سے بھی۔ ان میں جو آیات مجمل ہوتیں آپؐ ان کی تفصیل بیان فرماتے' ان کے اطلاق کی تقیید اور عموم کی تخصیص فرماتے۔ مثلاً: (۱) قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تو آپؐ نے اس کی تعمیل میں صحابہؓ کو نماز پڑھائی اور فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) (۴۰) یعنی ''نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ (۲) اسی طرح حج کی آیات کی تفسیر اپنے اقوال وارشادات سے بھی فرمائی اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا: ((خُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ)) (۴۱) یعنی ''اپنے حج کا طریقہ سیکھ لو''۔ اور عملاً حج کر کے بھی دکھایا۔ (۳) قرآن مجید میں زکوٰۃ کا حکم اجمالی طور پر موجود ہے' جیسے: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (البقرۃ: ۱۱۰) اور: ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام: ۱۴۱) اور: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ: ۲۶۷) اب زکوٰۃ کس چیز میں واجب ہے' اس کا نصاب کیا ہے' اس کی ادائیگی کے اوقات کیا ہیں' ان سب کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان آیات کی تبیین فرماتے ہوئے ان تمام سوالوں کا جواب دیا۔ اسی طرح دیگر احکام ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں حضرات صحابہ کرام j اس نوعیت کی آیات کے بارے میں خصوصیت سے سوال کیا کرتے تھے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سیدنا عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں:

سالتُ رسولَ اللّٰه ﷺ عَنِ الْكَلالَةِ . فَقَالَ : ((تَكْفِيْكَ آيَةُ الصَّيْفِ)) (۴۲)

''میں نے رسول معظم ﷺ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: تجھے آیۃ الصیف (۴۳) کافی ہے''۔

عہد صحابہ وتابعینؒ

حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام j نے ''آیات الاحکام'' میں موجود دیگر دلالتوں میں اجتہاد کا آغاز کیا' جن کے بارے میں وہ رسول اکرم ﷺ سے دریافت نہ کر سکے تھے اور نہ ہی اس سلسلے میں ان کے پاس کوئی علم پہلے سے موجود تھا۔ اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں:

(۱) سیدنا ابوبکر h کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲ ﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾ کی تفسیر اجتہاد سے کی اور فرمایا:

قد رأيتُ في الكلالة رأيًا ' فان كان صوابًا فمن اللّٰه وحده لا شريک له' وان يک خطأ فمني ومن الشيطان' واللّٰه بريء منه ' ان الكلالة ما خلا الولد والوالد[٤٤]

''میں نے کلالہ کے بارے میں ایک رائے اختیار کی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی جانب سے ہے' اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے' اور وہ یہ ہے کہ کلالہ سے مراد وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ باپ''۔

(۲) سیدنا عمر بن خطاب h نے ایک قول کے مطابق ارشادِ باری تعالیٰ ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ (البقرۃ:۱۹۶) میں اجتہاد کرتے ہوئے حج تمتع سے منع کیا' لیکن کبار صحابہ' سیدنا علیؓ' سیدنا ابن مسعودؓ' سیدنا ابوموسیٰؓ اور سیدنا ابن عمر j نے ان کی مخالفت کی۔[٤٥]

علاوہ ازیں اس سلسلے میں نمایاں ترین صحابہ کرام میں ابن مسعودؓ' ابن عمر اور ابن عباس j کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات نے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کی شکل میں قرآنی مطالب کو تشنگانِ علم تک پہنچایا اور ان کے طرزِ فکر کا اثر ان کے شاگردوں میں بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ تفسیر قرآن اور خصوصاً فقہی تفسیر کے حوالے سے مختلف مدارس وجود میں آئے۔ تلامذۂ ابن مسعودؓ نے مدرسۂ کوفہ کی بنیاد رکھی' فیض یافتگانِ ابن عمرؓ کے ہاتھوں مدینہ کا مکتب تشکیل پایا اور ترجمان القرآن سیدنا ابن عباسؓ کے لائق شاگردوں نے مکہ مکرمہ میں حلقۂ تفسیر قرآن قائم کیا۔[٤٦]

عہد تدوین

صحابہ کرام j اور ان کے شاگرد تابعینؒ کے دور میں ''تفسیر آیات الاحکام'' پر توجہ تو دی جاتی تھی لیکن اس کا دائرہ افتاء وتدریس کے میدان تک ہی محدود تھا اور تحریری شکل میں کوئی باقاعدہ تفسیر موجود نہ تھی۔ ''احکام القرآن'' پر پہلی باقاعدہ کتاب امام مقاتل بن سلیمان الخراسانیؒ (متوفی ۱۵۰ھ) نے لکھی۔ یہ تفسیر بالماثور تھی۔ البتہ مصنف نے مختلف آراء بیان کر کے ان میں ترجیح کا اسلوب اختیار کیا۔[٤٧]

آیاتِ احکام پر لکھنے والے ائمہ مجتہدین میں سے ایک مجتہد امام یحییٰ بن زکریا بن سلیمان القرشی

الکوفیؒ (متوفی ۲۰۳) بھی ہیں۔[۴۸] بعدازاں معروف مذاہب کے ائمہ اوران کے تلامذہؒ نے اس سلسلے میں کتابیں لکھیں، جن کا ذکر سطورِ ذیل میں کیا جارہا ہے۔

مذہب شافعی

☆ ان میں سب سے مشہوراوراوّلین مصنف امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) ہیں، جنھوں نے ''احکام القرآن'' پر مستقل کتاب لکھی، لیکن یہ دستیاب نہیں۔ان کی ایک کتاب اسی نام سے شائع ہوچکی ہے، جسے مشہور محدث اور ''السنن الکبریٰ'' کے مؤلف امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقیؒ نے جمع کیا ہے۔علامہ زاہدالکوثریؒ نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کی اپنی تصنیف کردہ کتاب ''احکام القرآن'' کی ہمیں اطلاع نہیں ہوسکی، لیکن ان کی مختلف کتابوں سے امام بیہقی نے ایک مستقل کتاب مرتب کی ہے۔[۴۹] واللہ اعلم!

☆ شافعی فقہ کے اسلوب پر ایک تفسیر امام الکیاالہراسیؒ نے بھی ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی ہے۔ موصوف امام غزالیؒ کے رفیق تھے۔ اپنی کتاب کے مقدمہ میں مقصدِ تالیف 'امام شافعی کے استدلالات کی شرح' بتاتے ہیں۔ان کا منہج یہ ہے کہ امام شافعی کے دلائل جمع کرتے ہیں اورانہی کے طریق پر چلتے ہوئے مزید دلائل کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔[۵۰]

امام الکیاالہراسیؒ اورامام بیہقیؒ کی کتابوں کے اسلوب میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کی کتاب مستقل طور پران کی اپنی تصنیف ہے، جبکہ مؤخرالذکر نے محض امام شافعیؒ کے استدلالات جوکہ متفرق تھے، یکجا کر دیے ہیں اوران پرکوئی اضافہ نہیں کیا۔

مذہب اہل عراق

احکامی آیات پراہل عراق کے زاویۂ نگاہ سے لکھی گئی کتب میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

☆ ''احکام القرآن''۔ یہ امام علی بن موسیٰ بن بزدادالقمی کی تحریر کردہ ہے۔

☆ ایک ہزارصفحات پرمشتمل امام ابوجعفرالطحاویؒ کی ''احکام القرآن''۔امام طحاوی عمومی طور پر، قطع نظر ان کے اسلوب ترجیح سے، محدثین کے منہج پر چلتے ہیں۔

☆ امام ابوبکراحمد بن علی الرازیؒ (المعروف بالجصاص) کی کتاب ''احکام القرآن'' جوکہ بہت مشہور و معروف ہے، یہ تین جلدوں پرمشتمل ہے۔کتاب انتہائی قابل قدر ہے، لیکن اپنے مذہب کوترجیح دینے کی کوشش کی گئی ہے، خواہ بعیدتاویل ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔اس کا اردوترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

☆ ''تلخیص احکام القرآن''، جس کے مؤلف الجمال بن السراج محمود بن احمد القونویؒ ہیں۔

☆ سرزمین ہند کے شہرۂ آفاق اصولی اورفقیہہ ملاجیونؒ کی ''التفسیرات الاحمدیہ'' بھی آیات الاحکام ہی

کی تفسیر پر مشتمل ہے۔کتاب مختصر ہونے کے باوجود انتہائی مفید ہے۔(۵۱)

مذہب اہل مدینہ

جن تفاسیر میں اہل مدینہ کے اسلوبِ فکر کو ملحوظ رکھا گیا ہے‘ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

☆ مالکیۂ بصرہ کے معتبر عالم امام اسماعیل القاضیؒ کی کتاب ’’احکام القرآن‘‘۔امام الجصاصؒ نے اس پر تنقید بھی کی ہے۔

☆ اسماعیل قاضیؒ کی اسی کتاب کا اختصار بکر بن العلاء القشیریؒ نے ’’مختصر احکام القرآن‘‘ کے نام سے کیا ہے۔

☆ علاوہ ازیں ’’احکام القرآن‘‘ ہی کے نام سے ابن بکیرؒ ‘ابن العربیؒ اور ابن فرسؒ نے بھی مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ان میں سے علامہ ابن العربیؒ کی کتاب انتہائی مقبول ومعروف ہے۔ (۵۲)

آیات الاحکام پر متأخرین کی کتب

متأخرین میں اس موضوع پر دو کتابیں خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں‘جن سے احکام القرآن کا کوئی طالب علم مستغنی نہیں ہوسکتا۔فخر المتأخرین علامہ صدیق حسن خان القنوجی البخاریؒ کی کتاب ’’نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام‘‘ اور علامہ محمد علی الصابونی کی ’’روائع البیان تفسیر آیات الاحکام فی القرآن‘‘۔

اول الذکر تفسیر میں فاضل مفسرؒ نے اپنے اندازے کے مطابق تمام آیاتِ احکام کی تفسیر کی ہے اور اختصار و جامعیت کو ملحوظ رکھا ہے۔اپنے موضوع پر انتہائی مفید اور قابل قدر کتاب ہے۔اس کا اردو ترجمہ ہمارے شیخ محترم حافظ محمد الیاس اثری حفظہ اللہ نے کیا ہے جو شائع ہو کر دستیاب ہے۔

علامہ الصابونی کی کتاب جدید اسلوب پر لکھی گئی ہے۔یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے‘اس میں تقابلی انداز اختیار کیا گیا ہے اور تمام ائمہؒ کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔مؤلف کتاب کی تفسیر‘ فقہ اور دیگر موضوعات پر تیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں جس سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقہی اسلوب پر قرآن کی مکمل تفاسیر

اوپر جن تفاسیر کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف احکامی آیات ہی کی تفسیر پر مشتمل ہیں اور ان میں دیگر آیات کی تفسیر نہیں کی گئی۔لیکن کئی ایسی تفسیریں بھی ہیں جن میں مکمل قرآن مجید کی تفسیر کی گئی ہے‘البتہ ’’آیات الاحکام‘‘ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے‘اس لیے ان کا شمار فقہی تفاسیر میں ہوتا ہے۔ان میں سے ایک شہرۂ آفاق تفسیر علامہ القرطبیؒ کی ’’**الجامع لاحکام القرآن**‘‘ ہے جو کہ تفسیر القرطبی کے نام سے مشہور ہے۔اس تفسیر کو اہل علم کے ہاں مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔

☆ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی ’’تفسیر مظہری‘‘ بھی انہی تفاسیر میں شامل ہے۔یہ تفسیر بھی برصغیر

کے اہل علم کے ہاں انتہائی مقبول و متداول ہے۔ اصل کتاب فارسی میں تھی لیکن اب اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، جس سے اردو دان طبقہ بھی مستفید ہو سکتا ہے۔

علم ''آیاتُ الاحکام'' کی اہمیت

قرآن مجید کی احکام پر مبنی آیات کا علم حاصل کرنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ احکامِ الٰہی پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کا علم ہوگا۔ اس پہلو سے ایک عام آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ بطورِ خاص ان آیات کو سمجھنے کی کوشش کرے جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، نکاح، طلاق جیسے مسائل کا ذکر ہے کہ یہ روزمرہ میں ہر شخص کو پیش آتے ہیں۔

☆ 'آیات الاحکام' ایک دوسرے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں، اور وہ یہ ہے کہ علماء نے اس کا ذکر اجتہاد کی اوّلین شرائط میں کیا ہے۔ جب تک 'آیات الاحکام' سے واقفیت نہ ہو کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہو سکتا۔

● الشیخ محمد الخضری بکؒ شرائطِ اجتہاد کے تحت لکھتے ہیں:

فالكتاب هو الاصل ولا بد من معرفته ، ولا يلزم لصحة الاجتهاد معرفته كله بل ما يتعلق باحكام الافعال منه (۵۳)

''قرآن مجید تو اصل بنیاد ہے اس لیے اس کی معرفت انتہائی ضروری ہے۔ لیکن اجتہاد کے لیے مکمل قرآن کا علم لازم نہیں بلکہ احکام سے متعلقہ حصے کی واقفیت ہی کافی ہے''۔

● مشہور مصری عالم علامہ محمد ابوزہرہؒ کہتے ہیں:

انه يجب ان يكون عالماً بدقائق آيات الاحكام فى القرآن(۵۴)

''مجتہد کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن کی آیاتِ احکام کی گہرائی سے واقفیت رکھتا ہو''۔

● علامہ حافظ محمد بن فضل الدین محدث گوندلویؒ فرماتے ہیں:

الاول: ان يكون عالما منصوص الكتاب والسنة' فان قصر فى احدهما لم يكن مجتهدا ولا يجوز له الاجتهاد ولا يشترط معرفته بجميع الكتاب والسنة بل بما يتعلق منهما بالاحكام(۵۵)

''اجتہاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کی نصوص کا علم ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی علم نہ ہوا تو وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے اجتہاد جائز ہے۔ اس باب میں کتاب وسنت کی تمام نصوص کا علم ضروری نہیں بلکہ صرف احکام سے متعلقہ آیات واحادیث کی معرفت ہی کافی ہے''۔

● 'اصول الفقہ الاسلامی' میں ہے:

الاول ان يعرف الشخص معانى آيات الآحكام المذكورة فى القرآن الكريم لغة

وشرعًا (٥٦)

''اجتہاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ مجتہد قرآن مجید کی احکامی آیات کے لغوی وشرعی مفہوم سے باخبر ہو''۔

● صاحب 'الوجیز' لکھتے ہیں:

ومن شروط الاجتهاد التى تلزم المجتهد معرفة الكتاب ' اذ هو اصل الاصول ومرجع كل دليل ' فلا بد للمجتهد ان يعرف آياته جميعا معرفة اجمالية ' ويعرف آيات الاحكام فيه معرفة تفضيلية لان من هذه الآيات تستنبط الاحكام الشرعية العملية(٥٧)

''ایک مجتہد کے لیے اجتہاد کی لازمی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کی معرفت رکھتا ہو کہ یہ اصل الاصول اور ہر دلیل کا مرجع ہے۔ لہٰذا مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کی تمام آیات کی اجمالی واقفیت اور آیات الاحکام کا تفصیلی علم رکھتا ہو' کیونکہ انہی آیات سے شریعت کے عملی احکام اخذ ہوتے ہیں''۔

● علامہ محمد بن صالح العثیمینؒ شرائطِ اجتہاد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

للاجتهاد شروط منها: ١۔ ان يعلم من الادلة الشرعية ما يحتاج اليه فى اجتهاده كآيات الاحكام واحاديثها(٥٨)

''اجتہاد کی کچھ شرائط ہیں' ان میں سے پہلی یہ ہے کہ وہ ان شرعی دلائل سے واقف ہو جن کی اجتہاد میں ضرورت ہے' مثلاً احکام سے متعلقہ آیات اور احادیث''۔

● قرآن مجید کی احکامی آیات کی اسی اہمیت کے پیش نظر حجۃ الہند حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کریم کے علومِ پنجگانہ میں اسے سرفہرست رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

ليعلم ان معانى القرآن المنطوقة لا تخرج عن خمسة علوم

''جاننا چاہیے کہ قرآن مجید کے بیان کردہ معانی پانچ علوم سے باہر نہیں''۔

بعدازاں علم الاحکام کا ذکر کر کے لکھا ہے:

وتفصيل هذا العلم منوط بذمة الفقه(٥٩)

''اس علم کی تفصیل بیان کرنا فقیہہ کی ذمہ داری ہے''۔

اہل علم کے مندرجہ بالا اقوال وارشادات سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ''علم آیات الاحکام'' کا سیکھنا فقہ واجتہاد کی لازمی شرط اور ایک فقیہہ اور مجتہد کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح عام لوگوں کو بھی اس سے باخبر ہونا چاہیے تاکہ وہ احکامِ الٰہی پر کما حقہ عمل پیرا ہو سکیں۔

حواشی

(١) احمد بن عبد الحليم ابن تيميه' مقدمة اصول التفسير' فصل فى النبى ﷺ بين لاصحابه معانى القرآن۔

(٢) مشكوٰة المصابيح، كتاب الاعتصام، بحواله سنن ابی داؤد والدارمی ومسند احمد وغیره۔
(٣) ابوداؤد السجستانی، المراسیل: ٢٤٩/٢۔ (روایت صحیح ہے)
(٤) صحیح الجامع للالبانیؒ، ح ٢٩٣٧۔
(٥) الدارمی، السنن: ١٤٥/١۔
(٦) الخطیب البغدادی، الکفایة فی علم الروایة، ص ١٦۔
(٧) الدارمی، السنن: ١٤٥/١۔
(٨) ابن تیمیه، مقدمة اصول التفسیر، فصل فی تفسیر القرآن بالقرآن و تفسیره بالسنة واقوال الصحابة۔
(٩) عماد الدین ابو الفدا اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (مقدمة): ١٩/١، ٢٠، دارالسلام، الریاض، الطبعة الثانیة ١٤١٨ھ/١٩٩٨ء۔
(١٠) ابن تیمیة، مقدمة اصول التفسیر، فصل فی اختلاف السلف فی التفسیر وانه اختلاف تنوع۔
(١١) محمد بن عیسیٰ الترمذی، الجامع، ابواب التفسیر عن رسول اللّٰہﷺ، تفسیر سورة البقرة۔
(١٢) ابوعبد اللّٰہ الحاکم، معرفة علوم الحدیث۔
(١٣) شاه ولی اللّٰہ الدهلویؒ، الفوز الکبیر۔
(١٤) ابن تیمیةؒ، مجموع الفتاویٰ: ٣٦٤/١٥۔
(١٥) مسند احمد، ح ١٦٥٩٢۔
(١٦) ابن تیمیةؒ، مقدمة اصول التفسیر۔
(١٧) بحوالہ قرآن فہمی کے اصول، مرتبہ حافظ حسن مدنی
(١٨) ابن جریر الطبری، مقدمۂ تفسیر جامع البیان۔
(١٩) محمد بن اسماعیل البخاریؒ، الجامع الصحیح، کتاب التفسیر۔ نیز کتاب الایمان، باب ظلم دون ظلم۔ نیز کتاب الانبیاء، باب قول اللّٰہ تعالی: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾.
(٢٠) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، ابواب فضائل القرآن عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی فضل القرآن، ح ٢٨٣١۔
(٢١) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیه۔ ح ٢٨٧٥۔
(٢٢) ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، ابواب التفسیر عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیه۔ح ٢٨٧٤۔
(٢٣) سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللّٰہ بغیر علم، ح٣٦٥٢۔ نیز سنن الترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللّٰہﷺ، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برایه، ح ٢٨٧٦۔ امام ترمذیؒ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے راوی سہیل بن حزمؒ کے بارے میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے۔ بعض صحابہؓ سے اسی طرح مروی ہے کہ انہوں نے بغیر علم کے تفسیر قرآن کرنے میں سختی کی ہے۔
(٢٤) ابن تیمیة، مقدمة اصول التفسیر، تفسیر القرآن بالرأی۔

(۲۵) یہ اور اس سلسلے کے دیگر واقعات مقدمة اصول التفسیر کی آخری فصل میں موجود ہیں۔

(۲٦) ابن تیمیة' مقدمة اصول التفسیر' ص ۸۲'۸۳۔

(۲۷) (ا) الدکتور علی بن سلیمان العبید' تفاسیر آیات الاحکام و مناهجها: ۲۵/۱۔ (ب) الدکتور فهد العندس' آیات الأحکام فی المغنی: ۲۲/۱۔

(۲۸) ایضاً۔

(۲۹) امام غزالیؒ نے المستصفی (٦/٤) میں' امام رازیؒ نے المحصول (۳۳/۲) میں اور علامہ الماوردیؒ نے ادب القاضی (۱۸۲/۱) میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

(۳۰) محمد صدیق حسن خان القنوجی البخاری' نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام' ص ۱۔ نعمانی کتب خانہ' لاہور۔

(۳۱) التقریر والتحبیر: ۳۹۰/۳۔

(۳۲) دیکھئے شرح التنقیح (ص٤۳۷)' شرح مختصر الروضة: (٤۱۵/۳)' البرهان فی علوم القرآن (٦/۲۔٤)' الاتقان: (۱۸۵/۲)' شرح الکوکب المنیر: (٤٦۰/٤)' تقریب الوصول: ص ٤۳۱۔ارشاد الفحول (۸۱٤/۲) طبع/صبحی حلاق' نثر الودود (۱٤۵/۲)'

(۳۳) الامام الحافظ عز الدین بن عبدالسلام السلمی (المتوفی ٦۰۰) کی کتاب کا نام 'الامام فی بیان ادلة الاحکام' ہے۔ عظیم اور قابل قدر کتاب ہے' جس سے فقہ کا کوئی طالب علم مستغنی ہوسکتا ہے اور نہ ایک فقیہہ اور عالم۔

(۳٤) شرح مختصر الروضة : ٤۱۵/۳۔

(۳۵) شرح التنقیح' ص ٤۷٦۔

(۳٦) الزرکشی' البرهان' ۷/۲۔۵۔

(۳۷) سیدنا عمر h کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے چھ ماہ بعد بچے کو جنم دیا تھا تو آپؓ نے اسے رجم کرنے کا ارادہ کیا۔ سیدنا علی h کو علم ہوا تو فرمایا: اسے رجم نہیں کیا جا سکتا۔ سیدنا عمر h کو پتا چلا تو آپؓ نے سیدنا علیؓ سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (البقرة:۲۳۳) یعنی مائیں دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ اور دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف:۱۵) یعنی دودھ چھڑانے اور حمل کی کل مدت ۳۰ ماہ ہے۔ اس میں سے دو سال نکل گئے جو مدت رضاعت ہے تو باقی چھ ماہ رہ جاتے ہیں' یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔ (سنن الکبریٰ للبیهقی' باب ما جاء فی اقل الحمل' ح۱۵۳۲٦'۱۵۳۲۷)

(۳۸) امام بیہقی اپنی سنن کبریٰ میں باب ما جاء فی اقل الحمل' ح۱۵۳۲۵ کے تحت روایت کرتے ہیں کہ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ جب عورت نو ماہ کے بعد بچہ جنے تو ۲۱ ماہ دودھ پلانا اس کے لیے کافی ہے۔ اور اگر ۷ ماہ بعد جنے تو ۲۳ ماہ اور ٦ ماہ بعد جنے تو ۲۴ ماہ دودھ پلانا کافی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا﴾۔

(٣٩) البرهان، ٢/٤۔٣۔

(٤٠)محمد بن اسماعيل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة......

(٤١) ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی، السنن، کتاب المناسك، باب الرکوب الی الجماء واستظلال المحرم، ح ٣٠١٢۔

(٤٢) رواه احمد فی المسند، ح ٢٦٢ من حدیث عمر بن الخطابؓ۔

(٤٣) آیة الصیف سے *مراد سورۃ النساء کی آخری آیت ہے جس میں کلالہ کا ذکر ہے۔ اسے* "آیة الصیف" *اس لیے کہتے ہیں کہ یہ گرمی کے موسم (فصل صیف) میں نازل ہوئی۔ دیکھئے تفسیر القرآن العظیم از امام ابن کثیر، مذکورہ آیت کی تفسیر۔*

(٤٤) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ٦١١/١ تفسیر آیت مذکورہ، دار السلام، الریاض۔

(٤٥) تفسیر ابن کثیر، *مذکورہ آیت کی تفسیر۔*

(٤٦) الخضیری، تفسیر التابعین، ٦٦٥/٢۔

(٤٧) تفسیر الخمس مائة آیة فی القرآن لمقاتل بن سلیمان، ص ٦٦، ٦٨۔

(٤٨) *اس کا ذکر ابن الندیمؒ نے الفہرست (ص ۵۷) اور الداودی نے 'طبقات المفسرین' (۳۶۲/۲) میں کیا ہے۔*

(٤٩) *دیکھئے* احکام القرآن للشافعیؒ، ص ١٤۔ دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ١٩٧٥ء (مقدمه)

(٥٠) الکیا الهراسی، احکام القرآن، ١/٢۔

(٥١) *حاشیہ نمبر ۴۹۔*

(٥٢) ایضاً۔

(٥٣) محمد الخضری بکؒ، اصول الفقه، ص ٤٠٥، طبع چهارم، ١٩٦٢ء، مطبعة السعادة۔

(٥٤) محمد ابوزهره، اصول الفقه، ص ٣٥٨، دارالفکر العربی۔

(٥٥) الحافظ محمد گوندلویؒ، بغیة الفحول فی شرح مختصر الاصول، ص ١٣٠۔

(٥٦) ڈاکٹر وهبه الزحیلی، اصول الفقه الاسلامی، ص ١٠٤٤، دارالفکر۔

(٥٧) الدکتور عبدالکریم زیدان، الوجیز فی اصول الفقه، ص٤٠٣، *فاران اکیڈمی لاہور۔*

(٥٨) محمد صالح العثیمینؒ، الاصول من علم الاصول، ص ١١٩۔ طبع دوم، ١٩٩٤ء دارالجیل بیروت، لبنان۔

(٥٩) الشاه ولی الله الدهلویؒ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، الباب الاول فی العلوم الخمسة التی بینهما القرآن العظیم بطریق التنصیص۔

❁❁❁

جماعت سازی اور اس کی بنیادیں

قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار☆

سابقہ مباحث کا خلاصہ

اس سلسلے کا پہلا مضمون ماہِ دسمبر ۲۰۰۷ء کے حکمت قرآن میں ''جماعت سازی کی ضرورت اور اس کی بنیادیں'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ قارئین کی سہولت اور ربط مضمون کے لیے پہلے اس کے مباحث کا خلاصہ دیا جارہا ہے۔

مذکورہ بحث کے تحت جو اہم اقوال جماعت کے مفہوم کے بارے میں ہیں یا جن کے لزوم کا احادیث میں حکم وارد ہوا ہے' کا ماحصل یہ ہے کہ جماعت کے مفہوم کے تین پہلو ہیں:

(۱) ایک تو یہ ہے کہ جماعت ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ایک امام (خلیفہ) پر شریعت کے تقاضوں کے مطابق مجتمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس ''جماعت'' کا لزوم واجب ہے اور اس سے خروج حرام ہے' جیسا کہ احادیث میں موجود ہے۔

(۲) الجماعۃ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے جو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ اور اجماعِ صحابہؓ کا التزام کرتے ہوں' اگرچہ ان کے پاس حکومت اور اقتدار موجود نہ ہو' جن کو اہل السنۃ والجماعہ کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جماعت ''مذہب حق'' کا نام ہے۔ جماعت کی یہ تفسیر کہ اس سے مراد صحابہ ہیں یا اہل علم ہیں یا اہل اجماع ہیں یا یہ کہ سوادِ اعظم ہیں' یہ سبھی کچھ ایک معنی کی طرف لوٹتا ہے اور وہ یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اس راستے پر چلنے والے ہوں جس پر اللہ کے رسول اور ان کے صحابہ کرامؓ تھے' خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ' اور چاہے اُمت کے احوال یا زمان ومکان کا کتنا بھی فرق کیوں نہ ہو۔ اسی لیے عبداللہ بن مسعود h کا فرمان ہے: جماعت وہ ہے جو حق کی موافقت پر ہو چاہے تم اکیلے ہی کیوں نہ ہو۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ میں ان کا قول یوں ہے: جماعت' اللہ کی اطاعت کی موافقت ہی میں ہوتی ہے چاہے تم اکیلے ہی کیوں نہ ہو۔ اور وہ احادیث جو افتراقِ اُمت سے متعلق ہیں اور ''یَدُ اللّٰہِ مَعَ الْجَمَاعَۃِ'' وغیرہ ساری اس جماعت حق پر دلالت کرتی ہیں جو اوپر ذکر کیا گیا۔

(۳) الجماعہ کا اطلاق عالم اسلام کی اُن تمام منظم تنظیموں پر ہوتا ہے جن کے دستور اور طریق کار میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی چیز موجود نہ ہو اور وہ اقامت دین ونفاذِ شریعت اور دعوتِ دین وغلبۂ دین کے لیے جدوجہد کرتی

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ' شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

ہوں' بقول مولانا گوہر رحمٰنؒ وہ سب کی سب الجماعہ یا جماعت المسلمین کی برادر تنظیمیں اور ذیلی شاخیں ہیں' بشرطیکہ وہ طریقۂ کار' حکمت عملی' تنظیم وتربیت کے نظام اور اجتہادی مسائل میں اختلافِ آراء کے باوجود پارٹی تعصب اور فرقہ واریت کے جراثیم سے محفوظ ہوں اور جسد واحد کے مختلف اعضاء کی طرح باہمی تعاون وتناصر کے ساتھ دعوتِ دین' اقامت دین اور غلبۂ دین کے لیے کام کرتی ہوں۔

یہی بات شیخ عبداللہ بن بازؒ نے بھی ذکر کی ہے:

''اگر اسلامی جماعات اہل السنۃ والجماعہ کے عقائد کے مطابق ہیں تو کوئی بات نہیں (یعنی جائز ہے) اگرچہ ایک سے زائد جماعات ہوں' لیکن ان کا ہدف اور طریق ایک ہونا ضروری ہے (یعنی اہل السنۃ والجماعۃ)''۔

(٤) اقامت دین کی جدوجہد کے لیے جماعت کا قیام والتزام لازم ہی نہیں' واجب اور فرض ہے۔

(٥) اُمت مسلمہ کے تمام افراد اگرچہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مکلّف ہیں' لیکن اس فرض کی ادائیگی ہر فرد کے لیے مشکل بھی ہے اور فرداً فرداً غیر منظّم طور پر یہ کما حقہٗ ہو بھی نہیں سکتا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تم میں ایسی جماعتیں قائم ہونی چاہئیں جو یہ فرض انجام دیں۔ ایسی جماعتیں گویا پوری اُمت کا فرض ادا کریں گی۔

بقول الشیخ عبداللہ بن بازؒ یہ جماعت اگر ایک ملک کے لیے ہو تو ملکی سطح تک کفایت کرنے والی ہونی چاہئے اور اگر یہ جماعت ایک قبیلے یا ایک گاؤں تک محدود ہو تو قبیلے یا گاؤں والوں کے لیے کفایت کرنے والی ہو۔ اگر یہ جماعت اپنے حلقۂ اثر میں کفایت کرنے والی نہ ہو تو پھر ایسی صورت میں باقی لوگوں سے حکم ساقط نہیں ہوگا بلکہ سب پر فرضِ عین ہوگا' بصورتِ دیگر سب گناہگار ہوں گے۔ یہ رائے امام نووی m کی بھی ہے۔

(٦) اسلامی شعائر کو زندہ رکھنا اسلامی حکومت کا کام ہے لیکن اسلامی حکومت اور حکمران نہ ہوں اور تطبیق شریعت نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ کام مسلمانوں کی ذمہ داری اور خاص طور پر علماء کے ذمے ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی جماعت سازی کی اہمیت اور ضرورت واضح ہوتی ہے کہ طبعی طور پر جماعت ناگزیر ہے اور اس قسم کے شرعی اُمور بغیر منظّم طریقے کے پیش کرنا ممکن نہیں۔ یہ ہے خلاصہ جماعت سازی سے متعلق سابقہ مباحث کا' واللہ اعلم۔

❁❁❁

جماعت سازی کی جو بنیاد اور طریقہ ہمیں قرآن میں ملتا ہے' رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ میں نظر آتا ہے اور اُمت مسلمہ کی ۱۴۰۰ سالہ تاریخ میں جس کی مثالیں ملتی ہیں' وہ صرف ایک ہے' اور وہ طریقہ بیعت کی بنیاد پر استوار ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیعت سے کیا مراد ہے؟

بیعت کا مفہوم

بیعت کے لغوی معنی ہیں اطاعت اور عہد۔ بیعت کی اصطلاح ''بیع'' سے نکلی ہے۔ لسان العرب میں ہے: **البیع ضد الشراء** یعنی ''بیع (فروخت کرنا) شراء (خریدنا) کی ضد ہے''۔ **والبیع شراء ایضاً وھو مع الاضداد** ''اور بیع شراء کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ اضداد میں سے ہے''۔ یعنی

دو متضاد معنی دیتا ہے۔لیکن بابِ افتعال سے ابتیاع کے معنی فقط خریدنے کے ہی نہیں فروخت کرنے کے بھی ہیں۔(۱)

قرآن مجید میں لفظ بیع اور اس سے متعلقہ مشتقات پندرہ مرتبہ وارد ہوئے ہیں۔ بصورت بَیْع' بَایَعْتُمْ' یُبَایِعُنَکَ' یُبَایِعُوْنَ' یُبَایِعُوْنَکَ' فَبَایِعْهُنَّ' تَبَایَعْتُمْ' بَیْعِکُمْ(۲)

بیع کے اصل معنی معاہدے کے اختتام پر ہاتھ ملانے کے ہیں اور بیعة بھی اسی سے ہے۔اور شریٰ کے معنی منڈی کی چھپل پہل کے ہیں۔ بیعة (ع) اصطلاح میں اس سے ایسا عمل مراد ہے جسے انجام دے کر کوئی شخص یا جماعت کسی دوسرے شخص کے اقتدار کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ خلیفہ کی بیعت وہ عمل ہے جس سے اس امر کا اعلان واعتراف مقصود ہوتا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا سربراہ ہے۔

بیعت دراصل اس حرکتِ جسمانی کو کہتے ہیں جو عرب قدیم میں دو شخصوں کے مابین کسی معاہدے کے طے پا جانے کی علامت تھی اور جس میں ہاتھ سے ہاتھ ملایا جاتا تھا۔اور بیعت میں معاہدہ کی علامت مصافحہ تھا۔ چونکہ ایک سردار کا انتخاب اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کرلینے کا عہد ہاتھ سے ہاتھ ملا کر کیا جاتا تھا' لہٰذا اس کے لیے وہی لفظ ''بیعت'' بولا جانے لگا۔ بیعت کرتے وقت بھی بیعت لینے والا اپنا ہاتھ بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ بلکہ صوفیہ کے بعض سلسلوں میں پیر مرید کا ہاتھ تھام کر بیعت لیتا ہے۔(۳)

علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

ان من اتفق المسلمون علی امامته وبیعته وجبت معونته(٤)

''جس کی حکومت پر مسلمانوں نے اتفاق کرلیا ہو اور انہوں نے اس کی بیعت کر لی ہو تو اس کی حکومت قائم ہو جائے گی اور اس کی مدد واجب ہو جائے گی''۔

ابن منظور افریقی نے بیعت کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

عبارة عن المعاقدة والمعاهدة کان کل واحد منها باع ما عنده من صاحبه واعطا خالصة نفسه وطاعته ودخیلة امره وقد تکرر ذکرها فی الحدیث(٥)

''بیعت اور مبایعت عبارت ہے دوطرفہ عہد و پیمان سے' گویا ہر ایک نے دوسرے پر اپنا سب کچھ فروخت کردیا ہے' اس کو اپنا دل اور نفس دے دیا ہے' اپنی اطاعت اور مخصوص امور اس کے سپرد کر دیے ہیں۔ بیعت کا ذکر حدیث میں بار بار آیا ہے''۔

قرونِ اولیٰ میں بیعت کا طریقہ ہاتھ سے ہاتھ ملانا تھا۔عوام کی جانب سے اعانت واطاعت کا وعدہ ہوتا تھا اور حکمران کی جانب سے قرآن وسنت کی پیروی' عوام کی خیر خواہی' قیامِ عدل اور دیگر فرائض حکومت ادا کرنے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہاتھ ملانا اسی دوطرفہ معاہدے اور معاونت واخوت کی ظاہری علامت تھی۔

بیعت کا شرعی پس منظر

بیعت ثابت ہے قرآن مجید سے اور سنت رسول اکرم ﷺ سے اور خلفاء راشدین کے دورِ خلافت اور اسلامی تاریخ سے!☆

بیعت قرآن مجید سے

(۱) بیعت الرضوان

بیعت الرضوان جس کو بیعة الشجرة بھی کہتے ہیں (جو ۶ ھجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر لی گئی تھی) یہ بیعت دراصل ایک ایسا اقرار نامہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ یہ اقرار نامہ صلح حدیبیہ سے کچھ دیر پہلے وقوع پذیر ہوا۔ آنحضور ﷺ اپنے صحابہ j کے ساتھ عمرہ کے ارادے سے آئے تھے اور مکہ سے چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان h کو اپنا ایلچی بنا کر قریش مکہ کے پاس بھیجا کہ آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام j کو طواف اور عمرے کی اجازت دی جائے' اس کے علاوہ مسلمانوں کو کسی بات سے غرض نہ ہوگی۔ اہل قریش نے حضرت عثمان h کو کچھ دیر کے لیے روک لیا۔ اسی دوران میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمان h کو شہید کر دیا گیا ہے۔ ان کے واپس نہ آنے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا کہ وہ بدعہدوں کے ساتھ جنگ کریں۔ اسی لیے آنحضور ﷺ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اس امر پر بیعت لی۔ چودہ سو مسلمانوں کی تمام جمعیت نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر مرمٹنے کی قسم کھائی۔ اس بیعت کو ''بیعت رضوان'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعدازاں جب معلوم ہوا کہ حضرت عثمان h کی شہادت محض افواہ تھی' تو مسلمان ارادۂ جنگ سے باز آ گئے۔ قرآن مجید میں اس بیعت کا ذکر یوں آیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ (الفتح: ۱۰)

''(اے نبی ﷺ) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے تھے' ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔''

آگے ان بیعت کرنے والوں کو بایں الفاظ مبارکہ بشارت دی جاتی ہے کہ:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۝﴾ (الفتح)

''اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے' ان

☆ نوٹ: ذیل میں ہمارے پیش کردہ بعض دلائل کا تعلق اگرچہ بیعت کبریٰ سے ہے' لیکن ان کا ذکر بطور تمہید کیا گیا ہے اور اپنے مدعا کے (بیعت صغریٰ یعنی تنظیمی بیعت) ثابت کرنے کے لیے آئندہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

کے دلوں کا حال اسے معلوم تھا' اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں انعام میں قریبی فتح بخشی۔''

بیعت رضوان کے بارے میں بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''حدیبیہ میں یہ بیعت درحقیقت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جان نثار کرنے کی وہ پیشکش تھی جس کے نتیجے میں مؤمنین کے قلوب پر سکینت کا نزول بھی ہوا اور ان کو 'فَتْحًا قَرِیْبًا'' جس سے مراد صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کے پھیلنے کے جو مواقع میسر آئے وہ بھی ہو سکتے ہیں اور فتح مکہ بھی' کی بشارت دی گئی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی سامنے آتی ہے کہ جب مؤمنین صادقین کی ایک معتد بہ جماعت پورے عزم کے ساتھ' اپنے آپ کو بغیر کسی خوف وخطر کے' کسی خطرے کے منہ میں جھونکنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور ہر چہ باداباد پر عمل کا پختہ فیصلہ کر لیتی ہے تو سکینت یعنی اطمینان ونشاطِ قلبی سے بھی اسے سرشار کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کامیابی کی بشارت بھی ملتی ہے''۔[٦]

(۲) بیعت النساء

بیعت کا یہ عمل صرف مردوں تک خاص نہیں تھا' بلکہ خواتین بھی بیعت میں شامل تھیں۔ بیعۃ النساء وہ بیعت ہے جو نبی اکرم ﷺ نے خواتین سے لی تھی' اس کا ذکر واضح الفاظ میں قرآن حکیم میں موجود ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾ (الممتحنة)

''اے نبی (ﷺ) جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اور اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم کرنے والا ہے۔''

بیعت سنت رسول اکرم ﷺ سے

(۱) بیعت عقبہ اولیٰ

رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سنت سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک سے زائد مرتبہ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بیعت طلب کی ہے۔ اسی طرح ہجرتِ مدینہ سے قبل عقبہ کے مقام پر دو مرتبہ بیعت لی ہے۔ ان میں سے پہلی بیعت عقبہ اولیٰ اور دوسری بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

بیعت عقبہ اولیٰ وہ اقرار ہے جو ۱۲ نبوی میں یثرب (مدینہ منورہ) کے بارہ آدمیوں نے آنحضورﷺ کے دست مبارک پر کیا۔ جب مکہ مکرمہ اور طائف کے مشرکین نے آنحضورﷺ کو دل برداشتہ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک نیا باب کھول دیا۔ یثرب سے ہر سال لوگ حج کرنے مکہ مکرمہ آتے تھے۔ آنحضورﷺ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام پیش کیا۔ مدینہ منورہ کے لوگ یہودیوں سے ایک نئے نبی کے آنے کی پیشین گوئیاں سنتے رہتے تھے۔ جب آنحضورﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ وہی رسول ہے جس کا ذکر یہودی علماء اکثر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۱ نبوی میں قبیلہ خزرج کے چھ افراد نے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ جا کر اسلام کا پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ اگلے سال حج کے موقع پر یثرب کے بارہ افراد مکہ مکرمہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آنحضورﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت چونکہ عقبہ کے مقام پر لی گئی تھی، اس لیے اسے بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جن باتوں پر آنحضورﷺ سے بیعت کی تھی وہ تقریباً وہی الفاظ تھے جو بیعت النساء کے حوالہ سے سورۃ **الممتحنۃ** میں وارد ہوئے ہیں۔ یعنی: (۱) ہم خدائے واحد کی عبادت کیا کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔ (۲) ہم چوری اور (۳) زنا کاری نہیں کریں گے۔ (۴) ہم اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔ (۵) ہم نبیﷺ کی اطاعت ہر اچھی بات میں کیا کریں گے۔

ان بارہ (۱۲) افراد کے نام یہ ہیں: (۱) ابوامامہ (اسعد بن زرارہ) (۲) عوف بن الحارث (۳) رافع بن مالک (۴) قطبہ بن عامر (۵) عقبہ بن عامر (۶) معاذ بن حرث (۷) ذکوان بن عبد قیس (۸) خالد بن مخلد (۹) عبادہ بن صامت (۱۰) عباس بن عبادہ (۱۱) ابوالہیثم (۱۲) عویم بن ساعدہ۔ اس کے بعد آنحضورﷺ نے مصعب بن عمیر h کو مسلمانوں کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لیے یثرب (مدینہ) روانہ کیا۔ انہوں نے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کی قیادت فرمائی اور تعلیم و تربیت اور تنظیم و دعوت کا کام آگے بڑھایا۔ اس کام میں اسعد بن زرارہ h نے ان کی بہت زیادہ مدد فرمائی تھی۔ (۷)

(۲) بیعت عقبہ ثانیہ

بیعت عقبہ اولیٰ کے اگلے سال ۱۳ نبوی میں حج کے موقع پر مدینہ منورہ سے ۷۵ افراد مکہ مکرمہ آئے اور انہوں نے عقبہ کے مقام پر آنحضورﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس موقع پر مدینہ منورہ کے لوگوں نے آپﷺ کو دعوت دی کہ آپؐ اور آپؐ کے رفقاء مدینہ تشریف لے چلیں، وہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے زیادہ کام ہو سکے گا۔ آنحضورﷺ نے آمادگی ظاہر کی۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی وہاں موجود تھے، مگر ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ انہوں نے کہا لوگو تمہیں معلوم ہے کہ قریش مکہ محمدﷺ کے جانی دشمن ہیں۔ اگر تم ان سے کوئی عہد باندھنے لگو تو پہلے سمجھ لینا کہ یہ نازک اور مشکل کام ہے۔ محمدﷺ سے عہد و پیمان کرنا سرخ اور سیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے۔ جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو، ورنہ بہتر ہے

کہ کچھ بھی نہ کرو۔ ان لوگوں نے حضرت عباس کو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں آنحضورﷺ سے عرض کیا کہ کچھ آپؐ ارشاد فرمائیں۔ آپﷺ نے انہیں اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھ کر سنایا۔ پھر آپﷺ نے فرمایا: (۱) کیا تم دین حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے؟ اور (۲) جب میں تمہارے شہر جا بسوں' کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل وعیال کی مانند کرو گے؟ ان لوگوں نے پوچھا: ایسا کرنے پر ہم کو کیا معاوضہ ملے گا؟ آنحضورﷺ نے فرمایا: ''جنت''۔ انہوں نے دوبارہ عرض کیا: یارسول اللہﷺ! ہمیں یہ یقین دلا دیجیے کہ آپ ہمیں کبھی نہ چھوڑیں گے۔ آپﷺ نے فرمایا: نہیں' میرا جینا' میرا مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔ اس آخری فقرے کو سنتے ہی یہ لوگ آپﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ براء بن معرور h نے سب سے پہلے بیعت کی۔ یہ بیعت ''بیعت عقبہ ثانیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت کے بعد آنحضورﷺ نے ان میں سے بارہ (۱۲) اشخاص کا انتخاب کیا اور ان کا نام نقیب رکھا اور انہیں اہل یثرب (مدینہ) میں تبلیغ اسلام کا حکم دیا۔[۸]

نقباء کا تقرر

بیعت لینے کے بعد رسول اللہﷺ نے فرمایا: مجھے اپنے میں سے بارہ نقیب یعنی معتمد نمائندے پسند کر کے دے دو' جو اپنے قبیلے کے اسی طرح ذمہ دار اور کفیل ہوں گے جس طرح عیسٰی d کے حواری کفیل تھے۔ انہوں نے بنوخزرج میں سے ۹ اور بنواوس میں سے ۳ نمائندے منتخب کر کے دے دیے۔ ابن حزم' ابن جریر' ابن ہشام' ابن سعد نے ان کے یہ نام نقل فرمائے ہیں:

(ا) **بنو خزرج**: (۱) اسعد بن زرارہ نقیب النقباء (چیئرمین) (۲) سعد بن ربیع (۳) عبداللہ بن رواحہ (۴) رافع بن مالک (۵) براء بن معرور (۶) عبداللہ بن عمرو بن حرام (۷) عبادہ بن صامت (۸) سعد بن عبادہ (۹) منذر بن عمر

(ب) **بنو اوس**: (۱) اسید بن حضیر (۲) رفاعہ بن عبدالمنذر (۳) سعد بن خیثمہ۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔[۹]

اس بیعت کے بعد مسلمانوں نے ہجرت کی اور تقریباً اڑھائی ماہ بعد خود رسول اللہﷺ نے بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ کو اسلام کا مرکز بنا دیا۔ نقیبوں کا تقرر اور دونوں بیعتوں میں اطاعت کے ساتھ امداد و نصرت اور جہاد کا وعدہ لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ بیعت عقبہ اصل میں اسلامی ریاست کی تمہید تھی اور دعوت کے ساتھ ایک سیاسی حکمت عملی بھی تھی۔

بیعت کی اقسام

رسول اللہﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جو مختلف اوقات میں' کئی قسم کے عہد لیے ہیں تو آپﷺ نے ہمیشہ بیعت ہی کا معاملہ فرمایا۔ چنانچہ علم حدیث کے ایک عظیم عالم

امام النسائی m نے دس مختلف اقسام کی بیعتوں کا ذکر کیا ہے جو آنحضورﷺ نے اپنے صحابہ کرام j سے لی تھیں: (۱) سمع وطاعت کی بیعت۔ (۲) ہمیشہ سچ بولنے پر بیعت۔ (۳) اس بات پر بیعت کہ حضورﷺ کو صحابہؓ میں سے کسی کو بھی ترجیح دینے کا اختیار ہوگا۔ (۴) اس بات کا عہد کہ ہم میدانِ جنگ سے نہ بھاگیں گے۔ (۵) اس بات کا وعدہ کہ ہم جہاد کریں گے۔ (۶) اس بات پر بیعت کہ ہم ہمیشہ عدل پر مبنی بات کہیں گے۔ (۸) ہر مسلمان کی خیر خواہی کی بیعت۔ (۹) اللہ کے راستے میں جان قربان کرنے پر بیعت۔ (۱۰) اس بات کا عہد کہ ہم رسول اللہﷺ کے حکم پر اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ لینے اور نظم قائم کرنے کا واحد طریقہ جو ہمیں رسول اللہﷺ کی سیرت اور سنت سے ملتا ہے وہ بیعت پر مبنی ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ کرام j خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ شعر جاری تھا: ؎

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا (۱۰)

بیعت خلفاءِ راشدین کے دورِ خلافت میں

(۱) بیعت ابوبکر صدیق h

صحیح بخاری کی روایات کا خلاصہ درج ذیل ہے: سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کے درمیان انتخابِ خلیفہ کے مسئلے پر پوری آزادی کے ساتھ مباحثہ ہوا' لیکن آخر میں حضرت عمر h کی تجویز پر مدینے کے لوگوں نے' جو اس وقت عملاً پوری قوم کے معتمد نمائندوں کی حیثیت رکھتے تھے' برضا و رغبت ابوبکر h کو پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس پر تمام لوگوں نے آپؓ کی بیعت کر لی۔ حدیث کے الفاظ ہیں: فَبَايَعَهُ وَبَايَعَهُ النَّاسُ (۱۱) دوسرے مقام پر الفاظ اس طرح آتے ہیں: وَبَايَعَهُ الْمُهَاجِرُوْنَ ثُمَّ بَايَعَتْهُ الْاَنْصَارُ (۱۲) ''بیعت کی ابوبکر h کی مہاجرین نے اور پھر بیعت کی ان کی انصار نے''۔ یہ بیعت خاصہ تھی جس میں مرکز میں موجود سارے مسلمان شریک نہیں ہو سکے تھے۔ دوسرے روز مسجد نبویؐ میں بیعت عامہ ہوئی جس میں سب لوگ شریک ہوئے۔ (فَبَايَعَهُ النَّاسُ عَامَّةً (۱۳) بیعت ابوبکر صدیق h کی تفصیلات مسند احمد' مصنف عبدالرزاق اور مجمع الزوائد میں بھی نقل ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں بھی یہ بات آئی ہے کہ مدینہ منورہ کے انصار و مہاجرین سب نے آپ کی بیعت کی تھی۔ (۱۴)

(۲) بیعت حضرت عمر فاروق h

حضرت ابوبکر صدیق h نے اپنے مرض موت میں حضرات عبدالرحمٰن بن عوف' عثمان بن عفان' سعید بن زید' اسید بن حضیر اور دیگر مہاجرین و انصار j سے حضرت عمر h کے متعلق مشورہ کیا۔ ان اکابر

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ اور رائے لینے کے بعد حضرت عثمان h سے کہا کہ عمر کے بارے میں میری وصیت لکھ لو۔ انہوں نے لکھ کر مہر لگا دی اور باہر جا کر لوگوں سے پوچھا: اَتُبَایِعُوْنَ لِمَنْ فِیْ هٰذَا الکِتَاب؟ فَقَالُوا نَعَمْ. فَاَقَرُّوا بِذٰلِکَ وَرَضُوا وَبَایَعُوْ ''کیا تم لوگ اس شخص کی بیعت کرتے ہو جس کا نام اس خط میں لکھا ہے؟ سب نے کہا: ہاں! چنانچہ سب نے ابوبکر صدیق h کی تجویز کو تسلیم کر لیا' راضی اور مطمئن ہو گئے اور عمر h کی بیعت کر لی''۔(۱۵) حضرت ابوبکر صدیق h نے وصیت نامہ لکھوانے سے قبل مہاجرین وانصار کے ممتاز ومعتمد نمائندوں کی رائے حاصل کی۔ ان کی رائے کے مطابق وصیت نامہ لکھوایا اور پھر مدینہ کے عام لوگوں سے استصواب کرایا۔ انہوں نے اپنی آزاد مرضی سے حضرت عمر h کی بیعت کی۔ تب جا کر خلافت فاروقی کو قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ ابوبکر صدیق h کی وصیت تو صرف ایک تجویز تھی' جس کو مسترد بھی کیا جا سکتا تھا' لیکن مسلمانوں نے اس کو قبول کر لیا۔(۱۶)

(۳) بیعت حضرت عثمان غنی h

زخمی ہونے کے بعد حضرت عمر h نے فرمایا: میری رائے میں ان چھ افراد سے زیادہ اہل اور موزوں کوئی نہیں ہے جن سے رسول اللہ ﷺ وفات کے وقت تک خوش تھے' یعنی حضرت عثمان غنی' حضرت علی المرتضیٰ' حضرت زبیر' حضرت طلحہ' حضرت سعد اور حضرت عبدالرحمٰن j۔ مشورے میں میرے بیٹے عبداللہ بن عمر i کو بھی شریک کر سکتے ہو' مگر خلافت میں اس کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اگر سعد بن ابی وقاص h کو خلافت مل گئی تو بہت اچھا ہوگا ورنہ جو بھی خلیفہ ہو اسے چاہیے کہ ان کی مدد حاصل کر لیا کرے۔ اس کے بعد آئندہ ہونے والے خلیفہ کو مہاجرین وانصار' دیہی آبادی اور غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔ چھ افراد کی اس کمیٹی نے خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار عبدالرحمٰن بن عوف h کو دے دیا۔ انہوں نے اہل مدینہ کے ساتھ طویل مشورے کیے۔ بخاری شریف' کتاب الاحکام کی روایت میں آیا ہے کہ لوگ تین رات تک عبدالرحمٰن بن عوف h کے پاس اپنی رائے دینے کے لیے آتے رہے۔ اس استصواب عام کے بعد حضرت علی اور حضرت عثمان i دونوں سے قرآن وسنت کی اطاعت کا وعدہ لیا اور کہا کہ مدینہ کے لوگ حضرت عثمان h ہی کو پسند کرتے ہیں' اس لیے ان کی بیعت کر لو۔ چنانچہ حضرت علی h اور مدینہ کے تمام لوگوں نے ان کی بیعت کر لی۔ (فَبَایَعَ لَهٗ عَلِیٌّ وَوَلَجَ اَهلُ الدَّارِفَبَایَعُوهُ)(۱۷)

بخاری شریف' کتاب الاحکام کی روایت میں عبدالرحمٰن بن عوف h کا قول اس طرح نقل ہوا ہے:

فَلَمْ اَرَهُمْ یَعْدِلُونَ بِعُثْمَانَ ..... فَبَایَعَهُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ وَبَایَعَهُ النَّاسُ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ وَاُمَرَاءُ الْاَجْنَادِ وَالْمُسْلِمُوْنَ (۱۸)

''لوگ عثمانؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے..... عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عثمانؓ کی بیعت کی۔ عام لوگوں اور

مہاجرین وانصار نے بھی ان کی بیعت کی اور فوجی افسروں نے بھی ان کی بیعت کی (جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے)''۔

(۴) بیعت حضرت علی h

حضرت عثمان h کی شہادت کے بعد اصحابِ رسولؐ نے حضرت علی h سے درخواست کی کہ خلافت کی ذمہ داری قبول کیجیے۔ آپؓ نے فرمایا میرا وزیر رہنا زیادہ بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو آپ ہی کی بیعت کریں گے۔ اس پر حضرت علی h نے فرمایا میری بیعت مسجد میں ہوگی' خفیہ نہیں ہوگی اور مسلمانوں کی آزاد مرضی کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ جب آپ مسجد میں تشریف لے گئے تو مہاجرین وانصار اور عام لوگوں نے بالاتفاق آپ کی بیعت کر لی۔(۱۹)

بیعت اسلامی تاریخ سے

رسول اللہ ﷺ کے مبارک ایام سے لے کر خلفاءِ راشدین کے دَور تک اور خلافتِ راشدہ سے لے کر خلافتِ عثمانی (۱۹۲۶ء) تک جتنی بھی اسلامی خلافتیں اور حکومتیں بنی ہیں وہ بیعت کے مسنون طریقے پر بنی ہیں' بلکہ آج بھی بعض نام نہاد حکمرانوں کی حکومتیں بیعت کے زیرِ سایہ رواں دواں ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ حکومتیں جائز تھیں یا نہیں' یہ ایک الگ موضوع ہے' جس پر تفصیلی گفتگو پھر کبھی ہوگی۔ لیکن ایک چیز اسلامی تاریخ سے واضح اور ثابت ہے اور وہ ہے بیعت۔

بیعت کا حکم

سنتِ رسولؐ اور سیرتِ صحابہؓ سے کیا سبق ملتا ہے؟ اسلامی ریاست کے معاملات جس کے سپرد کیے جائیں' اہل ایمان کے لیے اس کی اطاعت ضروری ہے' جب تک وہ اللہ کی اطاعت پر قائم رہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے تو اس کی فرماں برداری نہ کی جائے۔ ازروئے حدیث نبویؐ:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (۲۰)

''اللہ بزرگ وبرتر کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے''۔

ایک اور حدیث میں ہے:

((لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ)) (۲۰)

''کسی کا حکم ماننا جائز نہیں ہے' جب وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہو''۔

اس حدیث کے تحت تمام لوگ داخل ہیں' مسلمانوں کا امیر' امام' عالم دین' خاوند' باپ بھائی وغیرہ۔ حضرت عبادہ بن صامت h کہتے ہیں :

((بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ

وَالْمَكْرَهِ)) (۲۱)

''ہم نے رسول اللہ ﷺ کی سننے اور اطاعت کرنے کی شرط پر بیعت کی' خواہ اس میں تنگی ہو یا آسانی' خوشی کی صورت ہو یا ناخوشی کی (ہر حال میں اطاعت امیر فرض ہے)''۔

ایک اور حدیث میں ہے:

((اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ' فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ))(۲۲)

''ہر مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے' خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا ناپسند ہو' جب تک کہ اسے گناہ کا حکم نہیں دیا جاتا۔ پھر اگر اسے گناہ کا حکم دیا جائے تو پھر نہ بات سنی جائے گی اور نہ ہی اطاعت کی جائے گی''۔

ہاں خلیفہ یا صاحب امر' اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کر رہا ہو تو پھر اطاعت واجب ہے اور اگر صاحب امر اپنی اطاعت کا دعوے دار ہو تو اس کی اطاعت بھی معصیت خداوندی سمجھی جائے گی اور یہ بھی فسق ہو گا' کیونکہ غیر اللہ کی حاکمیت کفر ہے' ظلم ہے اور فسق ہے۔

اگر اہل ایمان جاہلیت اور یہود و نصاریٰ کی حکمرانی کی ولاء پرستی کریں گے تو ان کی ملتوں سے منسوب ہوں گے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو اُن سے ولاء (دوستی و وفاداری) کرتا ہے وہ انہی میں سے ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (المائدۃ)

''اور تم میں سے جو اُن کے ساتھ وفاداری کرے گا وہ ان ہی میں سے ہو گا' بے شک اللہ ظالم قوم کی رہنمائی نہیں کرتا''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلامی ریاست میں مسلمان حکمران کا جائز حکم ماننا واجب ہے اور گناہ یعنی غیر شرعی حکم ماننا ناجائز ہے' بلکہ اس کا نہ ماننا واجب ہے۔ یہ حکم تو امامت عظمیٰ اور بیعت کبریٰ سے متعلق تھا۔ سوال یہ ہے کہ جماعتی بیعت کی کیا حیثیت ہے؟ اہل علم کے نزدیک بیعت صغریٰ یعنی تنظیمی بیعت امارت صغریٰ کے عقد کے تحت درج ہے۔ اور بقول علماء کرام (۲۳) یہ ایک جائز کام کا عقد ہے' بلکہ بعض اوقات واجب ہوتی ہے اور اس پر وفا کرنا شرعاً لازمی ہے۔ استدلال کے طور پر یہ آیت مبارکہ پیش کی جاتی ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (الاسراء)

''اور عہد کو پورا کرو' یقیناً عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی''۔

علماء کرام کا کہنا ہے کہ یہ بیعت دراصل ایک عہد ہے اور مذکورہ دلیل کی روشنی میں عہد پر وفا کرنا واجب ہے' لہٰذا بیعت کبریٰ کی عدم موجودگی میں بیعت صغریٰ ہے اور ''**مالا یتم الواجب الا به فهو واجب**'' کے مصداق اس پر عمل کرنا ضروری تصور ہو گا۔

بیعت کی صفت اور صورتیں

بعثت نبوی ﷺ سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک ایسی صورت میں جب ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کا اختتام ہوا' بیعت کی متعدد صورتیں سامنے آئی ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) کلام اور مصافحہ دونوں: جیسا کہ بیعت الرضوان میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا' جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ﴾ (الفتح: ۱۰)

''جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تھا۔''

اور کلام عبادہ بن صامتؓ والی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے دور سے لے کر بنواُمیہ کے دور تک جاری رہا۔ بنواُمیہ کے دَور میں حجاج نے مزید چیزوں کا اضافہ کیا' جیسا کہ طلاق قسم وغیرہ۔ عباسی دور تک بدعت کا یہ سلسلہ جاری رہا' یہاں تک کہ امام مالک m نے ایسی بیعات کے خلاف فتویٰ دیا اور نتیجے میں ان کو اذیت اٹھانی پڑی۔

(۲) کلام: بعض اوقات صرف کلام پر بیعت تمام ہوئی' جیسا کہ **بیعة النساء** میں ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِرْجِعْ فَقَدْ بَایَعْتُکِ))[۲۴] ''تم رخصت ہو جاؤ' میں نے تم سے بیعت لے لی ہے''۔ اور اُمیہ بنت رقیقہ k کی روایت میں ہے: ((اِنِّیْ لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ))[۲۵] ''میں خواتین سے مصافحہ نہیں کرتا''۔

(۳) کتابت: ایسا بھی ہوا کہ صرف کتابت کے ذریعے بیعت تمام ہوئی۔ اس قسم کی بیعت کی بہترین مثال نجاشی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے لیے وہ لکھا ہوا خط ہے' جس کے آخر میں درج ہے:

وقد بایعتک وبایعت ابن عمک واصحابک واسلمت علی یدیه لله رب العالمین[۲۶]

''اور میں نے آپ کے ساتھ بیعت کی اور آپ کے چچا زاد کے ساتھ اور آپ کے اصحاب کے ساتھ' اور میں اسلام لاتا ہوں ان کے ہاتھ پر اللہ کے لیے جو ربّ العالمین ہے''۔

اور اسی طرح عبداللہ بن عمر i کی وہ بیعت ہے جو عبدالملک بن مروان کے لیے لکھی تھی:

بسم الله الرحمن الرحیم . اما بعد! لعبد الملک بن مروان امیر المؤمنین سلام علیک' فانی احمد الیک الله الذی لا اله الّا هو وأقر لک بالسمع والطاعة علی سنة الله ورسوله فیما استطعت[۲۷]

(۴) قرینة الحال: یعنی حالات اور ظروف کے مطابق بیعت کرنا۔ یہ بیعت عقود کی ساری قسموں میں جائز ہے' صرف عقد نکاح میں جائز نہیں ہے۔ پس ایک مسلمان کا کسی تنظیم کے پروگرامات کا انتظام وانصرام'

اس کی قیادت سے سمع وطاعت کا عہد اور شراکت اور ممبر شپ' یہ سب عبارت ہیں جانبین کی رضا پر۔ اسی پر عہد منعقد کیا جاتا ہے اور اسی کو **قرینۃ الحال** کہتے ہیں' اگرچہ مندرجہ بالا مراتب سے اس کا درجہ کم ہے۔

طریقۂ انتخاب

ہمارے سیاسی مفکروں نے نصب امام کے تین طریقے بتائے ہیں' جن کے مطابق خلفاءِ راشدین کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ ان تینوں طریقوں میں سے موقع ومحل دیکھ کر جس طریقے پر بھی عمل کر لیا جائے وہی طریقہ صحیح اور شریعت کے عین مطابق ہوگا۔

ہمارے پاس پہلی مثال حضرت ابوبکر صدیق h کے انتخاب کی ہے۔ ان کا انتخاب مجمع عام میں ہوا تھا اور ان کی خلافت پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ اس طریقے کو موجودہ اصطلاح میں عام انتخابات کہہ سکتے ہیں۔ دوسری مثال حضرت عمر فاروق h کے تقرر کی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق h نے اپنی وفات سے قبل اکابر صحابہؓ سے مشورہ کر کے حضرت عمر فاروق h کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اس لیے اگر حالات عام انتخابات کی اجازت نہ دیں تو نامزدگی بھی ہوسکتی ہے۔ امام ابوالحسن علی الماوردی نے نامزدگی کے اصول کو بھی نصب امام کا صحیح طریقہ تسلیم کیا ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت شارع d نے جنگ موتہ کے موقع پر سیدنا زید بن حارثہ' عبداللہ بن رواحہ اور جعفر بن ابی طالب j کو بالترتیب ایک دوسرے کا جانشین مقرر فرمایا تھا' بعینہٖ ایک امام بھی اپنے بعد ایک تو کیا بالترتیب دو تین جانشین نامزد کر سکتا ہے۔[۲۸]

ہمارے سامنے تیسری مثال حضرت عثمان غنی h کے تقرر کی ہے۔ حضرت عمر فاروق h نے اپنی وفات سے قبل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت زبیر' حضرت طلحہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص j پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور اپنے جانشین کا معاملہ ان پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے کافی سوچ بچار کے بعد باہمی صلاح ومشورہ سے کتاب وسنت اور شیخین کریمینؓ کی پیروی کی شرط پر حضرت عثمان h کے ہاتھ پر بیعت کر لی' اسے ہم موجودہ اصطلاح میں انتخابی عمل کہتے ہیں۔[۲۹]

آج کل مندرجہ بالا طریقوں کا قیاس اسلامی تحریکوں پر کیا جا سکتا ہے' بلکہ بعض اسلامی تحریکیں مندرجہ بالا میں سے کسی ایک پر عمل پیرا بھی ہیں جو کہ مذکورہ واقعات کی روشنی میں جائز ہے۔ چونکہ طریقۂ انتخاب میں مذکورہ تین طریقے ثابت ہیں' لہٰذا پہلا حق تو اسلامی ریاست کا ہے کہ مذکورہ تین طریقوں میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہو۔ لیکن اگر اسلامی ریاست موجود نہ ہو تو اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کرنے والی اسلامی تحریک اپنے طور پر کوئی طریقہ ایجاد کرنے کی بجائے مذکورہ طریقوں میں سے کسی ایک پر عمل کرے اور حدیث نبویؐ ﴿ وَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ﴾ کا مصداق بنے۔ واللہ اعلم بالصواب!

بیعت صغریٰ / تنظیمی بیعت

اس سے پہلے کہ ہم خلیفہ اور حاکم کے علاوہ کسی اور کے لیے شرعی بیعت ثابت کریں، یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ بیعت سے متعلق مذکورہ بالا مباحث ہم نے بطور تمہید ذکر کیے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ بیعت کبریٰ ہے یا صغریٰ، کیونکہ اُن میں سے کچھ بیعت کبریٰ پر دلالت کرتے ہیں اور کچھ بیعتِ صغریٰ پر۔ ہمارا مقصود صرف بیعت سے متعلق اپنا عمومی نقطۂ نظر پیش کرنا تھا۔ اب یہ بحث صرف بیعت صغریٰ سے متعلق ہوگی اور اس سے متعلق وارد نصوصِ قرآن وسنت اور سلف صالحین کے ثابت شدہ آثار پیش کیے جائیں گے۔ دلائل لانے سے پہلے لفظ بیعت سے متعلق دو تین اصطلاحات کی وضاحت مفید سمجھتا ہوں تاکہ ایک قاری بعض احتمالی دلائل کو سمجھ سکے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ بیعت ایک عہد، ایک میثاق اور ایک عقد ہے جس میں جانبین کو آپس میں جوڑا اور پابند کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں جب جانبین کی طرف سے اس معاہدے اور میثاق پر مکمل اتفاق ہو، جیسا کہ حدیث پاک میں موجود ہے: ((اَلَا تُبَایِعُوْنِیْ عَلَی الْاِسْلَامِ))[۳۰] ''کیا تم مجھ سے اسلام پر بیعت نہیں کرتے؟'' یہ بیعت اسلام ہے اور یہ دلیل ہے عقد اور معاہدہ کی۔

اس طرح لفظ ''عہد''، قسم، وفاء، ضمان، امان، دوستی، وصیت، میثاق وغیرہ کے معنی میں آتا ہے اور عہد سے متعلق وارد احادیث مذکورہ معنوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے۔ لفظ ''میثاق'' عہد کے معنی میں ہے۔ امام راغب اصفہانی کہتے ہیں: میثاق پکے عہد کو کہتے ہیں جو قسم اور عہد کی صورت میں ہو۔[۳۱] لفظ ''عقد'' کے معنی ہیں گرہ اور عہد۔ کہتے ہیں **عقد البیع اَو الیمین**: بیع یا قسم کو پکا کرنا۔ **عاقدہٗ و معاقدہ**: معاہدہ کرنا۔ **وتعاقد القوم**: ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کرنا۔[۳۲]

اب وہ دلائل جو بیعت صغریٰ پر دلالت کرتے ہیں، پیش خدمت ہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ تنظیمی یا جماعتی بیعت جو غیر حاکم یا خلیفہ کو دی جاتی ہے اور یہ کہ آیا یہ جائز بھی ہے یا نہیں، اس مبحث کا حصہ ہے۔

قرآن کریم سے دلائل

قرآن کریم سے بعض دلائل عمل صالح کے عہود اور مواثیق پر دلالت کرتے ہیں اور سب سے بڑا نیک اور صالح عمل الجہاد فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں جہاد کرنا)، اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنا اور خلافتِ راشدہ کا قیام ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ

اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ (النحل)

''اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم اس کو اپنے ذمے کرلو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد مت توڑو جبکہ تم ان پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو۔ بے شک اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور تم (مکہ کی) اس (دیوانی) عورت کے مشابہ مت بنو جس نے اپنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو خود ہی نوچ کر تار تار کر ڈالا۔ اس طرح تم اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر چڑھائی کرے۔ اللہ تعالیٰ اس (عہد و پیمان) کے ذریعے سے تمہاری آزمائش کرتا ہے' اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے ہو قیامت کے دن وہ ضرور تم پر (ان کی اصل حقیقت) ظاہر کردے گا''۔

ابن کثیر m نے فرمایا: ''یہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے اور وہ وعدوں اور میثاقوں سے وفا اور پکی قسم (حلف) کی حفاظت ہے''۔

ابن جریر m اپنی سند میں بریدہ سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ﴾ ''اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم اس کو اپنے اوپر ضامن کرلو''۔ یہ وہ بیعت ہے جو تم نے اسلام پر کی ہوئی ہے۔ ﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا﴾ ''اور تم اپنی قسموں کو مت توڑو بعد ان کے مستحکم ہونے کے''۔ تمہیں محمد ﷺ کی جماعت کی کمی اور مشرکین کی کثرت بوجھ نہ لگے کہ تم اپنے اسلام پر کی ہوئی بیعت کو توڑ دو''۔[۳۳] دیکھیں کس طرح عہد کی تفسیر بیعت پر کی!

اور امام ابن تیمیہ m طالب علم کے بارے میں فرماتے ہیں: جس نے اپنے استاد کو حلف (قسم) دیا اور پھر دوسری طرف منتقل ہو کر اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ حلف کیا' کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی جاہلیت والی عادت پر کیا۔ وہ یہ کہ استاد کے علم میں وہ حلف لیا ہوا تھا جو منتقل تھا پہلے سے دوسرے کی طرف۔ یہ ظالم ہے' سرکش (باغی) ہے۔ اپنے استاد کے عہد توڑنے والا ان کے عقد کا پابند نہیں ہے' اور یہ حرام اور گناہ ہے۔ عقد کا غیر پابند ہونا زیادہ بڑا گناہ ہے بنسبت ان لوگوں کے افعال کے جن کا عہد وہ نہیں کرتے۔ بلکہ اس طرح ایک استاد سے دوسرے استاد کی طرف منتقل ہونا اور حلف دینا حرام ہے۔ اس کی مثال مرے ہوئے خنزیر کی طرح ہے' بلکہ یہ تو نہ اللہ سے عہد پر وفا ہے نہ رسول کے ساتھ اور نہ پہلے استاد کے ساتھ عہد پر وفا ہے' اور ایسے شخص کی مثال ایک لاابالی اور کھلنڈرے انسان کی ہے جس کا نہ کوئی عہد ہو اور نہ کوئی وفا۔ جاہلیت کے زمانے میں لوگ ایسا کرتے تھے کہ اگر پہلے والے سے زیادہ طاقت ور شخص (سردار) مل جاتا تو پہلے والے کے عہد کو چھوڑ کر دوسرے سے عہد کر لیتے تھے۔ اور یہ ان لوگوں کا حال تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ

مَا تَفۡعَلُوۡنَ ○ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرۡبٰى مِنۡ اُمَّةٍ ؕ

''اور تم اپنی قسموں کو مت توڑ و بعد ان کے مستحکم ہونے کے حالانکہ تم اللہ کو گواہ بھی بنا چکے ہو۔ بے شک اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور تم (مکہ کی) اُس (دیوانی) عورت کے مشابہ مت بنو جس نے اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو خود ہی نوچ کر تار تار کر ڈالا''۔

اگر کسی نے کسی شخص سے عہد کیا اور قسم کھائی کہ وہ اس کے پیچھے چلے گا' لیکن پھر عہد توڑ کر واپس آ گیا تو وہ شیطان کے راستے میں جہاد کرنے والے تا تاری مجاہدین کی جنس سے ہوگا۔ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے نہیں اور نہ مسلمانوں کے لشکر میں شمار ہوں گے' بلکہ شیطان کے لشکروں میں شمار ہوں گے' اگر چہ وہ سمجھتے ہوں کہ ان کا شمار مسلمانوں کے لشکروں میں ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ استاد شاگرد سے کہے: **علیك عهد الله و میثاقهٗ** ''تم پر اللہ کے عہد و میثاق کی ذمہ داری ہے''۔ کہ تم چلو گے جو تمہیں لے کر چلے گا اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف اور چھوڑ دو جس نے اللہ کو اور رسول کو چھوڑا ہے اور تعاون کرو نیکی اور تقویٰ میں اور تعاون نہ کرو گناہ اور دشمنی میں' اور اگر حق میرے پاس ہے تو حق کی مدد کرو اور اگر میں باطل پر ہوں تو تم باطل کی مدد نہ کرو۔ جس نے اس (عہد) پر پابندی اختیار کی وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے' کیونکہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ سارا دین اللہ کا ہو جائے اور اللہ کا کلمہ ہی بلند ہو۔ (۳۴)

ذرا غور کریں' شیخ الاسلام ابن تیمیہ m نے استاد اور شاگرد کے درمیان طاعات پر عہد کی شرعی حیثیت کیسے ثابت کی اور کیسے ترغیب و ترہیب کا بہتر انداز اختیار کیا۔ حلف کو انہوں نے بیعت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس عہد کو انہوں نے واجب اور ضروری قرار دیا اور توڑنے والے کو غیر پابند اور اس کے اس کام کو حرام' بڑے گناہ' جاہلیت والی عادت' مرے ہوئے خنزیر' جنس تا تاری مجاہدین' شیطانی مجاہدین' شیطانی لشکر وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ پابندی کی صورت میں اس عہد (قسم) کو اللہ کے عہد و میثاق اور مجاہدین فی سبیل اللہ وغیرہ سے تعبیر کیا ہے ۔اسی طرح انہوں نے اس عہد کو نیکی' تقویٰ' اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت' حق کی نصرت اور دین کی نصرت اور کلمۃ اللہ کی سربلندی سے مشروط کیا۔ بصورتِ دیگر اسے جائز قرار نہیں دیا۔ دیکھئے امام ابن تیمیہ m نے حدیث سفر کی تشریح میں دو سے زائد افراد کے لیے امارت کو بطریقہ اولیٰ واجب قرار دیا تھا اور یہاں پر صرف دو بندوں کے لیے جو کہ صرف استاد اور شاگرد ہیں عہد کی صورت میں وفا واجب قرار دی اور عدم وفا کو جاہلیت والی عادت' مرے ہوئے خنزیر' بڑے گناہ وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ تو یہاں پر جب استاد اور شاگرد کے درمیان عہد اتنا اہم اور ضروری ہے تو اسلامی جماعتوں کے لیے بیعت اور بیعت کی صورت میں وفا بطریقہ اولیٰ واجب ہے۔ اگر غیر معمولی مرحلے میں یہ دونوں کام اتنے ضروری اور اہم ہیں تو اسلامی ریاست کی عدم وجود کی صورت میں عقلاً و شرعاً و قانوناً اسلامی جماعت جو اس اسلامی

ریاست کے وجود کے لیے اپنے تمام تر وسائل وذرائع صرف کرتی ہے ان دونوں وسیلوں کو اپنانے میں زیادہ حق بجانب ہے۔ بہرحال شیخ الاسلام ابن تیمیہ m کے مذکورہ قول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ عقد اور میثاق جائز نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو اور یہ تعبیر اس حدیث کے مصداق ہے :((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ))(۳۵) ''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی فرماں برداری نہیں ہے''۔اور گناہ میں وفا نہیں ہے۔لیکن مذکورہ قول سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلامی حکومت ہو یا کوئی اسلامی جماعت یا کوئی فرد بیعت اور عہد پر وفا کرنا واجب ہے' بصورت دیگر سخت قسم کے گناہ کا مرتکب ہوگا' کیونکہ شریعت میں عہد پر وفا کرنا لازم ہے۔

بیعت کے جواز اور عدم جواز میں اصل چیز علت ہے' یعنی جس کام پر معاہدہ اور تعاقد کیا جاتا ہے نہ کہ عہد وعقد۔ بذات خود اگر عہد اور عقد باطل کام پر ہو تو وہ باطل ہے اور اس بیعت اور عقد کا نفاذ جائز نہیں ہے' اور اگر باطل نہ ہو حق ہو اور اس میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہو تو وہ جائز ہے اور اس کا نفاذ اور التزام واجب ہے' اور خاص طور پر اگر کوئی اس پر عہد اور میثاق لے تو اس پر وفا نہایت ضروری ہے۔ایک جہت سے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور دوسری جہت سے اس وجہ سے کہ اس نے عہد و میثاق دیا ہے اس پر قائم رہنے کا اور عہد پر وفا واجبات میں سے ایک واجب ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝﴾ (الاسراء)

''اور عہد کو پورا کرو' بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔

اور فرمانِ الٰہی ہے:

﴿..... وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''اور جو لوگ (ان عقائد واعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل (صبر) رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں۔یہی لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ متصف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی (کہے جاسکتے) ہیں۔''

اور فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ﴾ (المائدۃ:۱)

''اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔''

اللہ عزوجل نے وعدہ خلافی کو فاسقین اور منافقین کی صفت قرار دیا ہے' جیسا کہ ان کے بارے میں فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

وَيُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝﴾ (البقرۃ)

’’جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو جن کو وابستہ رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور فساد کرتے ہیں زمین میں ۔ پس یہ لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں۔‘‘

ایک اور جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَيَـقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ ۝﴾ (الرعد)

’’اور جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کی پختگی کے بعد توڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں‘ ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی اور ان کے لیے (آخرت میں) بہت برا ٹھکانا ہے‘‘۔

اور اسی طرح عہد پر وفا کی دلیل حضرت یعقوب d اور ان کے بیٹوں کا واقعہ ہے جب حضرت یعقوب d نے اپنے بیٹوں کے ساتھ عہد و میثاق کیا کہ اپنے بھائی یوسف d کو واپس لائیں گے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَهٗ مَعَكُمۡ حَتّٰى تُؤۡتُوۡنِ مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَـتَاۡتُنَّنِىۡ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّحَاطَ بِكُمۡ‌ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوۡهُ مَوۡثِقَهُمۡ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ ۝﴾ (یوسف)

’’(یعقوب d نے) فرمایا کہ اُس وقت تک ہرگز اس کو تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم (میثاق) کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور ہی لاؤ گے‘ بجز اس کے کہ تم گھیر ہی لیے جاؤ۔ پھر جب وہ قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ (دیکھو) ہمارے اس قول و قرار پر اللہ نگران ہے‘‘۔

صاحب العمدۃ نے فرمایا: تو جب یوسف d نے اپنے بھائیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بھائی (بنیامین) کو اپنے باپ کے پاس سے لے کر آئیں تو ان کو ان کے والد نے اس پر قسم دی اور اسے ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میثاق لاؤ۔ اور یہ میثاق لوگوں کے معاملہ میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میثاق کو ’’مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ‘‘ (اللہ سے میثاق) سے موسوم اور تعبیر کیا ہے۔ جب یوسف d نے اپنے بھائی (بنیامین) کو چھپایا تو بڑے بھائی نے کہا:

﴿قَالَ كَبِيۡرُهُمۡ اَلَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اَبَاكُمۡ قَدۡ اَخَذَ عَلَيۡكُمۡ مَّوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنۡ قَبۡلُ مَا فَرَّطۡتُّمۡ فِىۡ يُوۡسُفَ‌ۚ فَلَنۡ اَبۡرَحَ الۡاَرۡضَ حَتّٰى يَاۡذَنَ لِىۡۤ اَبِىۡۤ اَوۡ يَحۡكُمَ اللّٰهُ لِىۡ‌ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ ۝﴾ (یوسف)

''ان میں سے جو سب سے بڑا تھا اس نے کہا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کو بیچ میں رکھ کر پختہ قول وقرار لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں تم قصور کر چکے ہو' پس میں تو اس سرزمین سے نہ ٹلوں گا جب تک کہ والد صاحب خود مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ تعالیٰ میرا یہ معاملہ فیصل کر دے' اور وہی بہترین حاکم ہے۔''

کیونکہ بنیامین کو چھوڑ کر جانا ان کے لیے نہایت کٹھن مرحلہ تھا اور وہ باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے' اس لیے باہم مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔(۳۶)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس شرط کے بارے میں فرمایا جو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ d سے باندھی تھی کہ وہ آگے ان کے ساتھ چل سکے اور وہ شرط جو موسیٰ d نے اپنے آپ سے کی تھی۔ خضر کی شرط کا ذکر اس آیت مبارکہ میں ملتا ہے:

﴿قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا﴾ (الکھف)

''(خضر نے) اس نے کہا اچھا اگر آپ میرے ساتھ ہی چلنے پر اصرار کرتے ہیں تو یاد رہے کسی چیز کی نسبت مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جب تک میں آپ اس کی نسبت کوئی ذکر نہ سناؤں''۔

اور موسیٰ d کی شرط جو انہوں نے اپنے آپ سے کی وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں یوں بیان ہوئی:

﴿قَالَ اِنْ سَاَلْتُکَ عَنْ شَیْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا ۝﴾ (الکھف)

''موسیٰ (d) نے جواب دیا مگر اب اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو بے شک آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا' یقیناً آپ میری طرف سے معذرت کو پہنچ چکے۔''

یعنی اب اگر سوال کروں تو اپنی مصاحبت کے شرف سے مجھے محروم کر دیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں' اس لیے کہ آپ کے پاس معقول عذر ہوگا۔ امام بخاری m نے اس مسئلے پر اپنی کتاب صحیح البخاری میں ایک مستقل باب کتاب الشروط میں باندھا ہے جس میں انہوں نے ابن عباسؓ سے اور انہوں نے اُبی بن کعبؓ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ d اور خضر کے قصے میں: ((**کانت الاولی نسیانا والوسطی شرطا و الثالثة عملاً**))(۳۷) ''پہلا بھول کر تھا' درمیانہ شرط کے طور پر تھا اور تیسرا جان بوجھ کر تھا''۔

ابن حجر m شرط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿اِنْ سَاَلْتُکَ عَنْ شَیْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِیْ﴾ ''خیر اب اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو بے شک آپ مجھے ساتھ نہ رکھنا''۔ اور موسیٰ d اس کی پابندی کرتے رہے اور دونوں کی آپس میں نہ کوئی کتابت ہے اور نہ کسی کو گواہ بنایا اور یہ دلیل ہے وقت اور ظروف کے مطابق شرائط وضع کرنے پر۔ حالات اور ظروف جن شرائط کے متقاضی ہوں اس پر طرفین چلیں کیونکہ خضر نے موسیٰ d سے کہا یہ تیسرا موقع ہے کہ آپ صبر نہ کر سکے اور اب خود آپ کے کہنے کے

مطابق میں آپ کو ساتھ رکھنے سے معذور ہوں''۔(۳۸)

﴿قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ﴾(الکھف:۸۷) ''اس (خضر) نے کہا بس یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان''۔جس پر موسیٰ d نے انکار نہیں کیا۔(۳۹)

یہ وہ سابقہ دلائل ہیں جو لوگوں کے درمیان معاہدوں اور میثاقوں اور شروط کی پابندی کی خاطر لیے جا سکتے ہیں' خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں' کیونکہ یہ معاہدے عام معاہدے ہیں' ان میں تخصیص نہیں۔ جو بھی نیک عمل مطلوب ومقصود ہو اور اس میں جانبین عہد کرنا چاہتے ہوں' مذکورہ اقوال کی روشنی میں وہ جائز ہے اور اسے وفا کرنا واجب ہے۔اور یہ سارے ذکر شدہ عہود غیر حاکم اور خلیفہ پر دلالت کرتے ہیں اور اس سے غیر خلیفہ والی امارتیں ثابت ہو جاتی ہیں' اس صورت میں جب اسلامی حکومت اور خلیفہ موجود نہ ہو' اور یہ دلائل کارآمد ہیں اسلامی جماعتوں کے لیے استثنائی صورتوں میں' کیونکہ یہ امارتِ صغریٰ کی لوازمات میں سے ہیں ۔اسی وجہ سے ایک اسلامی جماعت میں نظام سمع وطاعت صحیح اور اصل روح میں باقی رہتا ہے۔واللہ اعلم!

بیعت سنت اور سلف صالحین کے آثار سے

قرآن کریم سے مذکورہ سارے دلائل غیر خلیفہ کی بیعت (عہد) کے مشروع ہونے پر دلالت کر رہے تھے' اب ہم خلیفہ نہ ہونے کی صورت میں بیعت صغریٰ پر مزید دلائل پیش کرتے ہیں:

(۱) بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ: سوید بن صامت مدینہ کے وہ پہلے خوش قسمت انسان تھے جو رسول اللہ ﷺ سے متاثر ہوئے لیکن یہ جنگ بعاث میں قتل ہو گئے۔دوسرے خوش قسمت شخص ایاس بن معاذ تھے جنہوں نے کہا تھا: ''خدا کی قسم یہ اچھی باتیں ہیں''۔لیکن ان کا بھی بہت جلد انتقال ہو گیا۔(۴۰)

۱۱ نبوی میں حج کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے قبیلے خزرج کے چھ افراد سے منیٰ کی ایک گھاٹی (عقبہ) پر ملاقات کی۔انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ سال حج کے موقع پر پھر ملیں گے۔انہوں نے واپس جا کر اسلام کی تبلیغ شروع کی اور مدینہ کے ہر گھر میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہونے لگا۔ ۱۲ نبوی میں منیٰ کی اس گھاٹی پر حسبِ وعدہ حج کے موقع پر ۱۲ افراد نے رسول اللہ ﷺ سے دوبارہ ملاقات کی۔ اُس وقت آپ ﷺ نے ان سے جو بیعت لی تھی وہ اس بیعت کے مطابق تھی جو کئی سال بعد سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ میں مہاجر عورتوں کے ضمن میں بتائی گئی تھی۔اسی وجہ سے اس بیعت عقبہ اولیٰ کو مسند احمد اور سیرت ابن ہشام میں ''بیعت النساء'' کہا گیا ہے۔عقبہ اولیٰ کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔(۴۱)

ذوالحجہ ۱۳ نبوی میں ۷۳ مرد اور دو خواتین تیسری مرتبہ اسی عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے ملے۔ اس مرتبہ ان سے اطاعت کے ساتھ جہاد اور امداد کا عہد بھی لیا گیا تھا۔حضرت عبادہ بن صامت h نے اس بیعت کی نوعیت اس طرح بیان فرمائی ہے: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ عہد کیا تھا کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے خواہ ہماری طبیعت چاہے یا نہ چاہے اور ہم مالی اخراجات برداشت کریں گے خواہ خوش حال

ہوں یا تنگ دست ہوں۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اللہ کے رسول جب ہماری بستی یثرب (مدینہ) تشریف لائیں گے تو ہم ان کی مدد کریں گے اور ان کی حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنی جانوں، بیویوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ہم صرف جنت چاہتے ہیں۔ یہ تھی وہ بیعت جو ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کی تھی **(فهٰذا بيعة رسول الله التي بايعنا عليها)**۔ (٤٢)

مذکورہ بیعتیں (معاہدے) ایک ایسے وقت میں کی جاتی ہیں جب اسلامی ریاست اور حکومت کا وجود نہیں، انتہائی ضعف اور کمزوری کا عالم ہے۔ نہ کوئی برسرِ اقتدار ہے اور نہ اس وقت رسول اللہ ﷺ سربراہِ مملکت ہیں، بلکہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ بیعت پوشیدہ ہے ظاہر نہیں ہے۔ یہ بیعت ان لوگوں کی شرائط کے بالکل برعکس ہے جو حکمرانی کو بیعتِ عامہ کی صحت کے لیے شرط قرار دیتے ہیں، یعنی حاکم ہو اور سرے سے پوشیدہ نہ ہو، لیکن یہاں نہ تو رسول اللہ ﷺ حاکم ہیں اور نہ انہوں نے اس بیعت کا کوئی باقاعدہ اعلان کیا ہے۔ بہرحال یہ مقام بیعت عامہ کے خلاف ہے جو کہ مانعین کے نزدیک بیعت کی صحت کے لیے معتبر شرط ہے۔ یہ ایک صریح اور صحیح دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو ایک ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں جس میں حاکم اور خلیفہ والی صفات موجود نہ ہوں، بالفاظ دیگر قدرت اور ظہور کے اعتبار سے خلیفہ اور حکمران نہ ہو۔ رہا یہ قول کہ یہ بیعت رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے اور کسی اور کے لیے جائز نہیں ہے، اس حیثیت سے کہ وہ خلیفہ عام نہیں ہے اور اسے وہ اختیار حاصل نہیں ہے جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھا کہ لوگوں سے نصرت و جہاد پر اور اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے بیعت لے، تو یہ قول محتاج ہے خاص اور مخصوص دلیل کا — اور مخصوص دلیل کہاں ہے؟

سلف صالحین سے بھی کوئی دلیل منقول نہیں جو تخصیص پر دلالت کرتی ہو اور اس مسئلے میں مفید ہو۔ خصوصیات والا قول باطل اور مردود ہے، اس پر حجیت ثابت نہیں ہوتی اور نہ یہ توجیہ لائق اعتناء ہے، کیونکہ سلف صالحین میں سے کسی سے ثابت نہیں ہے کہ اس نے کہا ہو کہ یہ نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہے، بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے، جس کا بیان اپنے محل پر آئے گا۔ آنحضور ﷺ کے دست مبارک پر جو بیعت کی جاتی تھی وہ تصدیق نبوت و رسالت کے لیے نہ ہوتی تھی بلکہ آپؐ کے احکامات کی پیروی اور سمع و طاعت کا ایک عہد تھی۔ نبوت و رسالت کے اقرار کا نام تو ایمان ہے۔

(**۲**) رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شرط اللہ کی کتاب میں نہ ہو وہ باطل ہے، اگرچہ وہ سو شرائط کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ برحق ہے اور اللہ کی شرط پکی ہے''۔ (٤٣) یہ حدیث دلیل ہے شرطوں اور عہدوں کے جواز پر، جب تک اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مخالف نہ ہو، کیونکہ شریعت کے اصول میں سے ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت روا نہیں ہے۔ (٤٤) اسی طرح نہ گناہ میں منت (نذر) ہے اور نہ گناہ میں وفا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ﴾ (الانسان:۷) ''وہ نذر پوری کرتے ہیں۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ نَذَرَ اَنْ يُطِيعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَعْصِيَهُ فَلَا يَعْصِهِ))(۴۵)

''جس نے منت مانی اس بات پر کہ میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کروں گا پس وہ اطاعت کرے اور جس نے منت مانی اس وجہ سے کہ وہ گناہ کرے گا تو وہ گناہ نہ کرے''۔

(یہ علم میں ہونا چاہیے کہ منت بذات خود واجب نہیں ہے لیکن جب انسان خود اپنے اوپر اسے لازم قرار دے لے تو پھر یہ واجب بن جاتی ہے۔) بہرحال نہ گناہ میں نذر ہے اور نہ گناہ میں وفا ہے اور جب شرعی مخالفت دور ہو جائے تو کسی بھی شرط اور نذر سے وفا کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ایسا کام جس میں اللہ اور رسول ﷺ کی فرماں برداری ہو ایسی صورت میں شرط اور عہد پر وفا کرنا واجب ہو جاتا ہے' سخت درجے کی واجب' جیسا کہ ایک حدیث پاک میں ہے:

((اَلْمُسْلِمُوْنَ عِنْدَ شُرُوْطِهِمْ))(۴۶) ''اصل میں مسلمان شرطوں پر وفا کا پابند ہے''۔

اور یہ پابندی اسلام کی شدید حرص کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حذیفہ الیمان h کو حکم دیا تھا کہ قریش کے ساتھ اپنے عہد پر وفا کریں۔ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں اس حوالے سے ایک مستقل باب باندھا ہے: **باب الوفاء بالعهد** (باب اقرار کو پورا کرنا)۔ حدیث کچھ اس طرح ہے:

عن حذيفة اليمان رضی اللہ عنہ قال : ما منعنى ان اشهد بدرا الا انى خرجت انا وابى حسيل والده. قال : فاخذنا كفار قريش قالوا انكم تريدون محمدا فقلنا: ما نريده، ما نريد الا المدينة، فاخذوا علينا عهد اللّٰه وميثاقه لننصرف الى المدينة ولا نقاتل معه. فاتينا رسول اللّٰه ﷺ فاخبرنا الخبر فقال : ((انصرفا، نفى لهم بعدهم ونستعين اللّٰه عليهم)) (۴۷)

''حذیفہ الیمان h سے روایت ہے' مجھے بدر میں آنے سے کسی چیز نے نہ روکا مگر یہ کہ میں اپنے والد حسیل کے ساتھ نکلا (یہ حذیفہؓ کے والد کی کنیت ہے) تو ہم کو قریش کے کافروں نے پکڑا اور کہا تم محمد (ﷺ) کے پاس جانا چاہتے ہو؟ ہم نے کہا ہم ان کے پاس نہیں جانا چاہتے بلکہ ہم مدینہ جانا چاہتے ہیں۔ پھر انہوں نے ہم سے اللہ کا نام لے کر عہد اور میثاق لیا کہ ہم مدینہ کو پھر جائیں گے اور محمدؐ کے ساتھ ہو کر نہیں لڑیں گے۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو ہم نے یہ سب قصہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم مدینہ کو چلے جاؤ' ہم ان کا عہد پورا کریں گے اور ان کے مقابلے میں اللہ سے مدد چاہیں گے''۔

اگر ایک مسلمان ایفائے عہد کی وجہ سے اتنا پابند ہے کہ وہ روئے زمین پر اللہ کے بہترین بندے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ قتال میں شریک نہیں ہو سکتا اور اشرف اور مقدس معرکۂ بدر میں آپؐ کا ساتھ نہیں

دے سکتا تو کیا یہ من باب اولیٰ نہیں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ برضا ورغبت طاعات اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ پر معاہدہ (بیعت) کریں اور پھر اس معاہدے اور عہد پر وفا کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے عہد کو توڑنا نفاق اور منافقین کی صفات میں سے شمار کیا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے:

((اِذَا ائْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ وَاِذَا وَعَدَ خَلَفَ))(۴۸)

''منافق کو جب امانت دی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے' جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے' جب عہد کرتا ہے تو توڑ دیتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔''

جس بندے میں یہ چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان چار میں سے کوئی ایک پائی جائے تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی۔

(۳) اسی طرح خیر وطاعات پر شرعی عہود اور مواثیق کی دلیل ابن عباسؓ کی وہ حدیث ہے جو امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں ذکر کی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ : لما بلغ اباذر مبعث النبی ﷺ قدم مکة فاتی المسجد' فالتمس النبی ﷺ ولا یعرفه وکرہ ان یسأل عنه فراٰہ علی فعرف انه غریب : فقال له الا تحدثنی ما الذی اقدمک؟ قال ان اعطیتنی عهدا ومیثاقا لترشدنی فعلت. ففعل فاخبرہ قال : فانه حق وھو رسول اللہ ﷺ. فاذا اصبحت فاتبعنی (۴۹)

''حضرت ابن عباس i کہتے ہیں جب ابوذر h کو رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی خبر پہنچی تو وہ خود کھانے کا سامان اور پانی کا مشکیزہ لے کر مکہ میں آئے اور مسجد میں جا کر رسول اللہ ﷺ کی جستجو کی' لیکن خود حضور ﷺ کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے پوچھنا مناسب نہ جانتے تھے۔ خیر رات کو لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ نے دیکھ لیا اور پہچان لیا کہ کوئی مسافر ہے۔ تیسرا دن ہوا تو حضرت علیؓ عادت کی موافق پھر گئے اور ابوذر کو اٹھا کر لے گئے اور کہنے لگے کہ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہاں تمہارے آنے کا کیا سبب ہوا؟ ابوذرؓ نے کہا اگر مجھے آپ قول وقرار دیں کہ آپ میری رہنمائی کریں گے تو میں بتادوں گا۔ حضرت علیؓ نے اقرار کرلیا اور ابوذرؓ نے ان کو آنے کی وجہ بتادی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا بات سچی ہے' وہ خدا کے رسول ہیں' جب میں صبح کو جاؤں گا تو تم میرے پیچھے پیچھے چلے آنا''۔

یہ ایک طویل حدیث ہے۔ ہم نے صرف مطلوب حصے پر اکتفا کیا۔ دیکھئے' حضرت ابوذرؓ حضرت علیؓ سے عہد اور میثاق اس لیے لیتے ہیں کہ حضرت علیؓ ان کی رہنمائی کریں گے اور حضرت علیؓ اس معاہدے پر متفق ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوذر نہ خلیفہ ہیں اور نہ امیر' یہاں تک کہ وہ ابھی مسلمان بھی نہیں ہیں اور

اس سب کچھ کے باوجود حضرت علیؓ بن ابی طالب ان کے ساتھ عہد کرتے ہیں اور میثاق دیتے ہیں۔

(۴) اسی طرح امام بخاری m نے حضرت عثمانؓ کی بیعت پر اتفاق کے قصے میں ذکر کیا ہے۔ اگرچہ حدیث طویل ہے لیکن مطلوب حصہ یہ ہے:

ان عبد الرحمن بن عوف قال لعثمان و علی ایکما تبرأ من هذا الامر فنجعله الیه واللّٰه علیه والاسلام لینظرن افضلهم فی نفسه؟ فاسکت الشیخان فقال عبد الرحمن افتجعلونه الیّ واللّٰه علیّ ان لا آلوعن افضلکم؟ قالا نعم' فاخذ بید احدهما فقال لک قرابة من رسول اللّٰهﷺ والقدم فی الاسلام ما قدم علمت فالله علیک لئن امرتک لتعدلن ولئن امر عثمان لتسمعن ولتطیعن ثم خلا بالآخر فقال مثل ذلک فلما اخذ المیثاق قال ارفع یدک یا عثمان فبایعه فبایع له علی وولج اهل الدار فبایعوه(۵۰)

''(حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد) حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے کہا کہ تم میں سے جو شخص اس خلافت سے براءت ظاہر کرے گا ہم خلافت کو دوسرے کے سپرد کریں گے اور اللہ اور اسلام اس کا نگہبان ہوگا۔ ہر ایک کو غور کرنا چاہیے کہ اس کے اعتقاد میں کون شخص افضل ہے۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ خاموش رہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کیا آپ امر خلافت کو میرے اختیار میں دیتے ہیں کہ جس کو چاہوں خلیفہ بنادوں۔ خدا کی قسم تم میں جو افضل ہوگا میں اس کے حق میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ ہر دو صاحبان (عثمان وعلی i) نے کہا ہاں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت علی مرتضیٰؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا آپ کی رسول اللہﷺ سے قرابت ہے اور آپ کو اسلام میں قدامت حاصل ہے' اگر میں آپ کو سردار بنادوں تو آپ ضرور انصاف کریں گے اور اگر میں عثمان کو خلیفہ بنادوں تو آپ ان کی فرماں برداری اور اطاعت کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ سے بھی علیحدگی میں یہی کہا۔ جب انہوں نے دونوں سے میثاق لے لیا تو حضرت عثمانؓ سے کہا ہاتھ اٹھاؤ۔ حضرت عثمانؓ نے ہاتھ اٹھائے اور حضرت عبدالرحمٰن نے ان کی بیعت کی۔ ان کے بعد حضرت علیؓ نے بیعت کی۔ پھر مدینہ والے اندر آ گئے اور سب ہی نے حضرت عثمانؓ سے بیعت کر لی''۔

عبدالرحمٰن بن عوف بھی خلیفہ نہیں تھے لیکن اپنی بات منوانے کے لیے انہوں نے حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ دونوں سے عہد اور میثاق لیا تاکہ ان میں سے ایک کو خلیفہ بنا سکیں۔

(۵) اسی طرح بیعت عکرمہؓ بن ابی جہل کا معاملہ ہے۔ عکرمہؓ یرموک کے دن اُس پیاسے کی طرح جو سخت گرمی کے دن ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتا ہے' جنگ کے لیے روانہ ہوئے اور جنگ کے میدان میں جب ایک مقام پر مسلمانوں پر سخت وقت آ گیا تو عکرمہ بن ابی جہل اپنے گھوڑے سے اتر گئے' اپنی تلوار کی نوک کو

توڑ دیا اور رومیوں کی صفوں کے اندر گھس گئے۔ سپہ سالار خالد بن ولیدؓ جلد ہی ان کے پاس پہنچ گئے اور کہنے لگے اے عکرمہ اس طرح مت کرنا' اس لیے کہ اگر آپ قتل ہو جاتے ہیں تو اس کا مسلمانوں پر برا اثر ہو گا۔ عکرمہ نے کہا اے خالد مجھے چھوڑ دو' آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سابقہ رکھتے ہیں اور میں اور میرے والد (ابوجہل) رسول اللہ ﷺ کے سخت دشمن تھے۔ لہٰذا مجھے چھوڑ دیجیے تاکہ میں سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کروں' کیونکہ میں نے بہت سارے مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ لڑی ہے' اس لیے آج کے دن میں رومیوں سے بھاگ جاؤں' یہ ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ پھر مسلمانوں کے درمیان نعرہ لگایا اور کہا: مَنْ يُبَايِعُ عَلَى الْمَوْتِ کون ہے جو موت پر بیعت کرے؟ ان کے ساتھ اُن کے چچا الحارث بن ہشام اور ضرار بن الأزْوَر نے چار سو مسلمانوں کے ساتھ موت پر بیعت کی اور خالد بن ولید کے سامنے جنگ کا آغاز کیا اور سخت دفاع کیا۔ جب یرموک کا معرکہ مسلمانوں کی کامیابی پر تمام ہوا اُس وقت یرموک کی زمین پر تین زخمی مجاہدین پڑے تھے اور وہ الحارث بن ہشام' عیاش بن ربیعہ اور عکرمہ بن ابی جہل تھے۔ الحارث نے زخمی حالت میں پانی مانگا اور جب پانی ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا تو عکرمہ نے ان کی طرف دیکھا' تو انہوں نے کہا پانی عکرمہ کو دے دیں۔ اور پھر جب پانی عکرمہ کے سامنے پیش کیا گیا تو عیاش نے ان کی طرف دیکھا۔ عکرمہ نے کہا پانی عیاش کو دے دیں۔ جب پانی عیاش کو پیش کیا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ انہوں نے زندگی سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں' اور پھر جب لوگوں نے پہلے دو کی طرف دیکھا تو وہ دونوں بھی زندگی سے اپنی آنکھیں بند کر چکے تھے۔ (رضی اللہ عنہم)۔ (۵۱)

حضرت عکرمہ بن ابی جہل h نے یہ بیعت ایک ایسے وقت میں کی جبکہ وہ نہ خلیفہ تھے اور نہ امیر جیش' بلکہ امیر جیش تو انہیں منع کر رہے تھے۔ صحابہؓ کے اتنے بڑے مجمع میں کسی نے انکار نہیں کیا' اور چار سو صحابہؓ نے ان سے موت پر بیعت کر لی۔ یہ دراصل صحابہ کرامؓ کی طرف سے عکرمہؓ کے حق میں اقرار و تصویب تھا۔ ابن کثیرؒ بروایت سیف بن عمر اور وہ اپنے شیوخ کی سند سے ذکر کرتے ہیں کہ اس مجمع میں یرموک کے دن ایک ہزار صحابہؓ موجود تھے جن میں سے ایک سو بدری تھے۔ (۵۲) صحابہ کرامؓ کی اتنی کثیر تعداد کی موجودگی میں ایک صحابیؓ کا یہ طرزِ عمل دراصل موجود صحابہؓ کی طرف سے اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس بیعت کی مشروعیت پر دلیل ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس بیعت میں عکرمہ بن ابی جہلؓ صرف بیعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس پر ساتھی صحابہؓ تیار ہو جاتے ہیں۔

(٦) عبدالرحمٰن بن اشعث کی بیعت حجاج بن یوسف اور عبدالرحمٰن بن مروان کے خلاف (۸۱-۸۲ھ): تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ حجاج بن یوسف الثقفی نے سجستان سے آگے شاہ رتبیل پر حملہ کے لیے عبدالرحمٰن بن اشعث کو ایک لشکر دے کر بھیجا۔ اس نڈر' بہادر اور کامیاب کمانڈر نے رتبیل کے بہت بڑے علاقے پر لشکر کشی کی اور اس کے ایسے قلعوں پر قبضہ کر لیا جہاں تک رسائی ناممکن تھی۔ اس کے شہروں اور قصبات سے

بہت سا مال غنیمت حاصل کر لیا۔ پھر اُس نے مزید اندرونی علاقوں پر حملہ کرنے سے قبل حجاج کے پاس کچھ پیغام رساں بھیجے کہ وہ حجاج کو اس بہت بڑی فتح کی خوشخبری دیں اور مالِ غنیمت کا یہ خمس بھی ساتھ لے جا کر مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کرا دیں۔ عبدالرحمٰن نے ایک خط بھی لکھا جس میں حجاج سے اجازت چاہی کہ کچھ عرصہ کے لیے قتال بند رکھا جائے تا کہ علاقہ کے اندرونی و بیرونی راستوں اور طبعی حالات سے موافقت حاصل کر لی جائے۔ حجاج یہ خط پڑھ کر غضبناک ہو گیا اور عبدالرحمٰن کو جواب لکھا کہ تم کمزور اور بزدل ہو گئے ہو۔ نیز اس کو ہلاک کر ڈالنے اور لشکر کی قیادت سے برطرف کرنے کی دھمکی دی۔ عبدالرحمٰن نے لشکر کے سرکردہ کمانڈروں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے حجاج کا یہ خط پڑھا اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ اب کیا کیا جائے۔ کمانڈروں نے حجاج کے خلاف بغاوت اور اس کی اطاعت کا عہد توڑ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ عبدالرحمٰن نے کہا کیا اس مسئلے پر تم میری بیعت کرو گے اور اس کے خلاف جہاد پر مجھ سے تعاون کرو گے تا کہ اللہ عراق کی زمین کو اس کے قبیح اعمال سے پاک کر دے؟ اس پر لشکر نے عبدالرحمٰن کی بیعت کر لی۔ عبدالرحمٰن بن اشعث حجاج کے خلاف نفرت سے بھرے اپنے اس لشکر کو لے کر میدانِ کارزار میں اتر آیا۔ اس کے اور حجاج کے لشکروں میں تباہ کن معرکہ برپا ہوا جس میں عبدالرحمٰن مظفر و منصور رہا۔ اسی طرح اس نے سجستان اور ایران کے بیشتر علاقے پر غلبہ پا لیا۔ پھر حجاج سے کوفہ و بصرہ چھیننے کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ عبدالرحمٰن بن اشعث نے فقہاء و قراء کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی تو ائمہ مسلمین اور جلیل القدر تابعین کی ایک جماعت نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا، جن میں سعید بن جبیر، عبدالرحمٰن بن ابی جہل، عامر بن شرحبیل، امام شعبی اور ابوالبختری الطائی، کمیل بن زیاد و جبلہ بن زحر وغیرہ n سرفہرست تھے۔ فریقین کے درمیان معرکہ برپا ہو گیا۔ شروع میں تو عبدالرحمٰن بن اشعث حجاج اور اس کے لشکر پر بھاری رہا، پھر آہستہ آہستہ حجاج کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہو گیا، حتیٰ کہ عبدالرحمٰن بن اشعث کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے لشکر نے حجاج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔[٥٣]

بہرحال صدائے حق کی اس تحریک میں عبدالرحمٰن بن اشعث کے ساتھ جلیل القدر تابعین شریک ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس راستے میں شہید بھی ہو جاتے ہیں، لیکن عہد پر وفا کر کے آئندہ نسلوں اور اسلامی تحریکوں کے لیے ایک روشن تاریخ چھوڑ جاتے ہیں۔

(۷) اسی طرح جنگ صفین میں حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے درمیان جنگ میں حضرت علی h کے لشکر میں قیس بن سعد بن عبادہ h کے ہاتھ پر چالیس ہزار افراد نے موت کی بیعت کی۔[٥٤] جبکہ قیس نہ فوج کا امیر عام ہے اور نہ خلیفۃ المسلمین۔ یہ دلیل ہے ایسے عہود و مواثیق پر جن کو بیعت سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور یہ مسلمانوں کے درمیان جائز کام میں۔

(۸) ۶۱ھ میں بیعت اہل کوفہ: حضرت حسین بن علی i کے ہاتھ پر یزید بن معاویہ کے خلاف تقریباً اٹھارہ ہزار افراد نے بیعت کی۔[٥٥] واضح رہے کہ شروع میں یہ بیعت مطلق خروج سے متعلق نہیں تھی، بلکہ ان

کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا کہ وہ اسلام کے اجتماعی نظام کے بعض پہلوؤں کی حفاظت کرنا چاہتے تھے' لیکن بعد میں حالات ایسے بنے کہ انتہا خروج وقتال پر منتج ہوئی۔

(۹) بیعت اہل مدینہ (۶۱ھ): یہ بیعت صحابی رسولؐ عبداللہ بن حنظلہؓ کے ہاتھ پر خلیفۂ وقت یزید بن معاویہ کے خلاف کی گئی۔(۵۶)

(۱۰) ابن کثیر ذکر کرتے ہیں کہ اہل دمشق نے ۶۴ھ میں خلیفۂ وقت معاویہ بن یزید کے فوت ہو جانے کے بعد ضحاک بن قیس کے ہاتھ پر بیعت کی۔(۵۷)

(۱۱) ابن کثیر ذکر کرتے ہیں کہ ۶۴ھ کے واقعات میں اہل کوفہ نے جلیل القدر صحابی سلیمان بن صرد کے ساتھ عہد اور عقد کیا۔(۵۸)

(۱۲) اسی طرح ۱۲۱ھ میں زید بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالبؓ کے ہاتھ پر خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک کے خلاف کوفہ کے تقریباً چالیس ہزار لوگوں نے بیعت کی۔(۵۹)

(۱۳) یزید بن الولید نے خلیفۂ وقت الولید بن یزید بن عبدالملک (۱۲۶ھ) کے خلاف لوگوں سے بیعت لی تھی۔(۶۰)

(۱۴) ۱۲۷ھ میں معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نے امیر عراق عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے خلاف بیعت لی تھی۔(۶۱)

(۱۵) اسی طرح ۱۴۵ھ میں محمد نفس زکیہ (محمد بن عبداللہ) نے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کے خلاف بیعت کا علم بلند کیا تھا اور مدینہ کے اکثر و بیشتر لوگوں نے ان کی بیعت کر لی تھی۔ ابن جریر نقل کرتے ہیں کہ امام مالک نے اس بیعت کے حق میں فتویٰ دیا تو لوگوں نے کہا ہماری گردنوں میں منصور کی بیعت ہے۔ پھر انہوں نے کہا آپ لوگ جبری بیعت کی وجہ سے مکرہین ہیں اور مکرہین کی بیعت نہیں ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے امام مالک کے قول کی وجہ سے بیعت کی۔(۶۲)

(۱۶) ابراہیم بن عبداللہ بن حسن' محمد نفس الزکیہ کے بھائی ہیں۔ ان کے قتل کے بعد بصرہ میں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر ابوجعفر منصور کے خلاف بیعت کی۔(۶۳)

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مدینہ میں امام مالک محمد نفس زکیہ کے ساتھ تھے اور بصرہ میں ان کے بھائی کے ساتھ امام ابوحنیفہ' شعبہ بن الحجاج اور ہشیم تھے۔ آخر الذکر دونوں حدیث کے امام ہیں۔

(۱۷) اسی طرح سنت دلالت کرتی ہے کہ مہدی d کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ مسلمان ان سے بیعت کریں گے اس سے پہلے کہ وہ خلیفہ ہوں یا دنیا پر ان کو قدرت حاصل ہو۔ اس مسئلے میں یہ قوی دلیل ہے۔

(۱۸) ۲۳۱ھ میں احمد بن نصر الخزاعی خلیفۂ وقت واثق کے فسق و فجور اور بدعات کی وجہ سے شروع

میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر سری طور پر بیعت لیتے رہے' لیکن جب اس کا فسق وفجور انتہا تک پہنچ گیا تو انہوں نے خلیفۂ وقت کے خلاف' خاص طور پر خلق قرآن کے مسئلے پر' خروج کا اعلان کیا۔

مذکورہ بالا ساری کی ساری بیعتیں غیر خلیفہ امیر عام کی ہیں ۔اسلامی تاریخ میں مزید مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ خاص طور پر مابعد والے دور میں' مثلاً محمد بن عبدالوہاب کی تحریک و بیعت' ابن بادیس کی تحریک و بیعت' عبدالقادر الجزائری کی تحریک و بیعت' حسن البناء کی تحریک و بیعت' ابوالکلام آزاد کی تحریک و بیعت' سید احمد شہید بریلوی کی تحریک و بیعت' ملا عمر کی تحریک و بیعت۔ الغرض عالمِ اسلامی میں کوئی ایسا ملک نہیں جس میں ایک سے زائد اسلامی تحریکوں کا منہج بیعت کی مسنون بنیاد پر استوار نہ ہو۔

اس کے باوجود بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں خلیفہ اور حاکم وقت کے علاوہ کسی اور کے لیے بیعت ثابت نہیں ہے ۔ مذکورہ مثالوں کی روشنی میں یہ بات مضحکہ خیز ہے اور ان کا یہ کہنا کہ اس طرح کی بیعت سلف صالحین اور قرونِ اولیٰ سے ثابت نہیں' سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیا عکرمہ بن ابی جہل' ابوذر غفاری' حضرت علی' حسین بن علی' عبداللہ بن زبیر j' عبدالرحمٰن بن اشعث' سعید بن جبیر' عامر بن شرحبیل' امام مالک وامام ابوحنیفہ وغیرہ n سلف صالحین نہیں ہیں؟ اور کیا یہ قرونِ اولیٰ کے لوگ نہیں ہیں؟ اگر جواب نہیں میں ہے تو پھر صحیح بات کیا ہے؟ اور اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر **فَمَا جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا** کہ جو جواب آپ کا ہے وہ جواب ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی سلف صالحین کے منہج کے مطابق ہی چلتے ہیں تو پھر اعتراض کیوں؟ خاص طور پر جبکہ معاملہ طاعت فی المعروف والحق اور الجہاد فی سبیل اللہ کا ہو!

بہر حال تو جیہات تو بہت کی جا سکتی ہیں لیکن اصل حل کیا ہے؟ حل یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت اور اسلام کا نظامِ عدل وقسط مکمل طور پر قائم ہے تو ایسی صورت میں واقعتاً بیعت کی بنیاد پر جماعت سازی کی چنداں ضرورت نہیں' کیونکہ جماعت سازی اور بیعت بذاتِ خود مقصد نہیں ہے' مقصد اسلامی حکومت اور شریعت کے عادلانہ نظام کا قیام ہے اور وہ بذات خود موجود ہے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت موجود نہیں ہے' یا حکومت تو اسلامی ہے مگر اسلام کا نفاذ نہیں ہے تو پھر مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں اس عظیم مقصد کے لیے بیعت کی مسنون بنیاد پر جماعت سازی کریں' تحریک چلائیں اور بیعت کی اس مردہ سنت کو زندہ کریں تاکہ تحریک کی کامیابی کی صورت میں کارکن اور قائد دونوں پہلے سے ذہناً سمع و طاعت کے لیے تیار ہوں اور اس کے نتیجے میں واقعتاً اسلامی نظام کے قیام کے لیے ایک جامع و کامل منظّم صورت موجود ہو سکے۔oo (جاری ہے)

آئندہ مباحث

(۱) بیعت کے بارے میں معاصر علماء کے اقوال

(۱) ابوعبدالرحمٰن عقیل بن محمد بن زید المقطری المصری (۲) ڈاکٹر یوسف القرضاوی (۳) استاد ڈاکٹر جمال

الدین عطیہ (۴) ڈاکٹر فتحی یکن فتح عبدالستار (۵) الشیخ سلیمان العودہ (۶) مولانا ثناء اللہ امرتسری m (۷) شیخ ممتاز احمد عبداللطیف (۸) الشیخ د/ مصطفیٰ الطحان (۹) الشیخ عبدالعزیز عبدالقادر القاری (۱۰) الشیخ ولید بن علی الحسین (۱۱) شیخ زائد صلاح (۱۲) استاد مصطفیٰ مشہور m (۱۳) استاد الشہید حسن البناء m (۱۴) استاد عبداللہ ناصح علوان (۱۵) مولانا گوہر الرحمٰن (۱۶) امام حسین بن غنام (۱۷) دارالافتاء دیو بند (۱۸) حاصل کلام۔

<u>(۲) گزشتہ سے پیوستہ چند ضروری باتیں</u>

اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل مباحث ہیں: (۱) شبہ ایک اور اس کا حل (۲) شبہ ۲ اور اس کا حل (۳) ملک و ملت کی بڑی آزمائشیں (۴) مطلوبہ قوت (۵) زیر سطح (کرنے کا کام) (۶) طوبیٰ للغرباء (۷) رسول اللہ ﷺ کی جماعت کی خصوصیات (۸) غیر منظم کوششیں (۹) اسلامی انقلاب کے حامیوں سے اپیل (۱۰) گزری ہوئی زندگی کا محاسبہ (۱۱) خلاصۃ الکلام۔

حواشی

(۱) کشاف ' اصطلاحات الفنون ' بذیل مادۃ۔

(۲) دیکھئے: محمد فؤاد عبدالباقی' المعجم المفهرس لألفاظ القرآن بذیل' مادۃ۔

(۳) اردو دائرۃ المعارف الاسلامیۃ' مادۃ بیع/بیعۃ ص۲۸۹۔۲۹۳' جلد۵' طبع ۱۹۸۵' بارِ دوم' ناشر رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی' لاہور پاکستان وشاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا' از سید قاسم محمود' ص ۴۵۸' مادۃ بیعت '، ناشر الفیصل' لاہور۔

(۴) المغنی لابن قدامۃ ۵۲۶/۸ طبع مصر ۱۹۶۹ء۔

(۵) لسان العرب ۲۶/۸' مادۃ بیع۔

(۶) اسلامی انقلاب کے لیے التزامِ جماعت اور لزوم بیعت۔ از ڈاکٹر اسرار احمد' ص۷۹' شائع کردہ مکتبہ الفضل' صدر کراچی' بار اول ۱۹۹۵ء۔

(۷) اسلامی سیاست' ص۱۷۴ از مولانا گوہر رحمٰن۔

(۸) البیعۃ ۔ مفہومھا ومدی مشروعیتھا لغیر الحاکم د/محمد عبداللطیف البنا بحوالۃ اسلام۔ اون لاین و شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا' مادۃ بیعت' ص۴۵۸۔

((۹) دیکھئے سیرت ابن ہشام۱۔۴۴۲/۲۔ وطبقات ابن سعد۲۲۲/۱۔ وتاریخ طبری۲۳۸/۲۔۲۳۹۔ ومسند احمد۳۲۵/۵۔ والکامل لابن الأثیر۹۹/۲۔ والبدایۃ لابن الاثیر۱۵۹/۳۔ وفاء الوفا للمھودی۲۳۰/۱دارالمصطفی طبع بیروت ۱۹۷۱ء۔ بحوالہ اسلامی سیاست' ص ۱۷۵۔۱۷۶ از مولانا گوھر الرحمٰن۔

(۱۰) صحیح البخاری وصحیح مسلم ومسند احمد۔

(۱۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' ۵۱۸/۱۔ اصح المطابع کراچی ۱۹۶۱۔

(۱۲) صحیح البخاری' کتاب المحاربین' ۱۰۱۰/۲۔

(١٣) صحيح البخاری' کتاب الاحکام' باب الاستخلاف ١٠٧٢/٢ وجامع الاصول ٦٨٧/٤_٦٩٥۔

(١٤) مسند احمد١/٥٥_٥٦ و ٢١/١ طبع بیروت۔ ومصنف عبدالرزاق٤٣٩/٥_٤٤٥ طبع بیروت ١٩٧٢۔ ومجمع الزوائد ١٨٢/٥_١٨٣ بیروت ١٩٦٧ء

(١٥) ابن سعد ١٩٩/٢_٢٠٠ ومنتخب کنز العمال برحاشیه مسند احمد١٧٧/٢_١٨٧۔

(١٦) اسلامی سیاست ٣٣١ از مولانا گوہر رحمن۔

((١٧) صحيح البخاری' کتاب المناقب ٥٢٣/١۔ الاحکام١٠٨٠/٢ ۔ وجامع الاصول ١٢٤/٤_١٢٨۔

(١٨) بحواله اسلامی ریاست' ص ٣٣٣۔

(١٩) تاریخ طبری ١٥٢/٥ ۔ والکامل١٩٠/٣۔ ابن سعد٣١/٣۔ الریاض النضرة٣٢٤/٢ طبع مصر١٩٥٣ بحواله اسلامی ریاست' ص ٣٣٤۔

(٢٠) مسند احمد' ح ١٠٤١۔

(٢١) صحيح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصية انما الطاعة فی المعروف۔ وصحيح البخاری' کتاب الاحکام' باب٤' رقم الحديث ١٨٤٠۔

(٢٢) متفق علیه' بخاری' کتاب الاحکام۔

(٢٣) متفق علیه' بخاری' کتاب الاحکام۔

(٢٤) *تفصیل آگے آرہی ہے۔*

(٢٥) رواه مسلم والنسائی۔

(٢٦) مسند احمد۔

(٢٧) الثقات لابن حبان۔

(٢٨) رواه البخاری ٩/٢۔

(٢٩) الماوردی' الاحکام السلطانية' ص ١٣۔

(٣٠) الکامل فی التاریخ لابن الاثیر الجزری مطبوعه لائیڈن ١٨٦٨' جلد٣' ص ٥٥ بحواله تاریخ و ثقافت ص١٥۔ ١٧مئی ١٩٨١ء ***شعبہ تاریخ ومطالعہ پاکستان بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔***

(٣١) ابن الاثیر' النهاية ١٧٤/١۔

(٣٢) مفردات غریب القرآن از راغب اصفهانی۔

(٣٣) المنجد عربی/اردو' مادة عقد' ص ٥٧١ طبع دار السلام۔

(٣٤) تفسير ابن کثیر ٦٠٥/٢۔

(٣٥) مجموع الفتاویٰ ١٩/٢٨_٢١۔

(٣٦) تفسير احسن البیان' طبع دار السلام۔

(٣٧) صحيح البخاری' ح ٢٧٢٨۔

(٣٨) تفسير احسن البیان (حاشیه)' ص ٣٩٥۔

(۳۹) فتح الباری۵/۳۲٦۔

(٤۰) سیرت ابن ھشام ۱۔۲/٤۲٦۔٤۲۷۔

(٤۱) سیرت ابن ھشام ۱۔۲/٤۲۸۔ و طبقات ابن سعد۱/۲۱۹۔ و تاریخ طبری۲/۲۳٤۔ والکامل ۲/۹۵'۹٦۔ والبدایه٤۱۹۔ وجوامع السیر لابن حزم ٦۹'۷۰ طبع گوجرانواله۔

(٤۲) رواه البخاری۔

(٤۳) رواه البخاری و مسلم۔

(٤٤) رواه البخاری و مسلم۔

(٤۵) رواه البخاری والترمذی والنسائی وابی داوٗد واحمد وابن ماجه والبیهقی وابن خزیمه وابن حبان۔

(٤٦) رواه البخاری' کتاب الاجارة' باب السمرة۔

(٤۷) صحیح مسلم' بشرح النووی' ص ٦۷' باب الوفاء بالعهد ' کتاب الجهاد والسیر' طبع نعمانی کتب خانه' باکستان۔

(٤۸) رواه البخاری ومسلم وابن حیان وابوعوانه والبیهقی۔

(٤۹) رواه البخاری' کتاب فضائل الصحابة' باب اسلام ابی ذر غفاریؓ' ح ۳٦٤۸۔وعن ابن عباس' ص ۸۷۲۔۸۷۷ طبعة المکتبة العربیة لاهور۔ تحقیق د/مصفطی دیب البغا۔

(۵۰) رواه البخاری' کتاب فضائل الصحابة' باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفانؓ' ح ۳٤۹۷' ج۲۔

(۵۱) البدایة والنهایة٦ /۱۱۔ **مزید دیکھئے** الاصابة الترجمة ۵٦٤۔ وتهذیب الاسماء ۱/۳۳۸ و خلاصة التهذیب۱/۲۲۸۔ تاریخ الاسلام للذهبی ۱/۳۸۰ بحواله (واصحابود ذوند پلوشی لدکتور عبدالرحمن رأفت پاشا (پشتو ترجمه) مترجم بشار)۔

(۵۲) البدایة والنهایة٦/۱۱ ۔

(۵۳) نفس المصدر۹/۳۵ وتذکرة تابعین از عبدالرحمن رأفت پاشا' ناشر منشورات لاهور۔

(۵٤) فتح الباری۱۳/٦۳۔

(۵۵) البدایة والنهایة۸/۵۲۰ ومابعدها۔

(۵٦) نفس المصدر۔

(۵۷) نفس المصدر۸/۲۳۹۔

(۵۸) نفس المصدر۸/۲٤۷۔

(۵۹) نفس المصدر۹/۳۲۷۔

(٦۰) نفس المصدر۱۰/۸۔۱۱۔

(٦۱) نفس المصدر۱۰/۲۵۔

(٦۲) نفس المصدر۱۰/۸۲۔۹۰۔

(٦۳) نفس المصدر۱۰/۹۱۔۹٦۔

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : رہبرِ حج وعمرہ ـــــ مسائل ومعلومات
مؤلف : محمد اختر الحسن
ضخامت : 336 صفحات ۔ قیمت: صرف ایک کلمۂ خیر
ناشر: مسعود اختر حسن، 76۔کارن وال ایونیو، ساؤتھ ہال، مڈل سیکس، لندن یوبی 1۔2 ایس اے، انگلینڈ
ملنے کا پتہ: محمد اعجاز الحسن، 1- بیت الحسن، مدینہ گلی، مسلم روڈ، نزد عمر فاروق مسجد، سمن آباد، لاہور

محمد اختر الحسن گزشتہ چالیس سال سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ اس دوران چار مرتبہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، جبکہ پانچ بار رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی حاضری کا شرف بھی انہیں مل چکا ہے۔ حج وعمرہ کی ادائیگی کے دوران انہوں نے لوگوں کو مختلف نوع کے مسائل سے دوچار ہوتے دیکھا تو اس حوالے سے ایک جامع راہ نما کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اسی آرزو کے نتیجے میں یہ کتاب ضبطِ تحریر میں آئی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو حج اور عمرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں تیاری سے لے کر اختتام تک تمام ضروری معلومات حاصل ہیں، جو انہوں نے بڑی محنت اور کاوش سے درجنوں کتب کے مطالعے سے اخذ کی ہیں۔

''رہبر حج وعمرہ'' کا آغاز موضوع سے متعلق اہم اصطلاحات کی تشریح سے ہوتا ہے، جبکہ پوری کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے مندرجات کچھ یوں ہیں:

(۱) خانہ کعبہ کی تاریخ، اس کی تعمیر، غلافِ کعبہ، خصوصیاتِ مکہ، حج کا بیان، خواتین کے لیے کچھ ضروری ہدایات
(۲) قرآن وحدیث کی روشنی میں سوال وجواب کے انداز میں مسائل حج وعمرہ اور ان کے آداب
(۳) عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ اور دعائیں
(۴) سعی کی ادائیگی کا طریقہ
(۵) حج کے پانچ دنوں کے تمام مراحل مع تفصیلات
(۶) مدینہ منورہ کا سفر اور رسول اکرم ﷺ کے روضۂ مبارک پر حاضری
(۷) مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت گاہوں کا بیان

یوں تو حج اور عمرہ ادا کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اتنی مفصل، جامع اور مکمل معلومات پر مبنی کوئی کتاب اس کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ ''رہبرِ حج وعمرہ'' کو اگر حج اور عمرہ کا انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

مؤلف نے اس کتاب کو فروخت کرنے کے لیے نہیں بلکہ خواہش مند افراد/اداروں کو محض ایک کلمۂ خیر کے عوض مفت فراہم کرنے کے لیے محدود پیمانے پر شائع کیا ہے۔ بذریعہ ڈاک منگوانے والے حضرات خط کے ہمراہ 10x12 انچ کے لفافے پر ۳۵ روپے کا ٹکٹ لگا کر ارسال کریں۔ جو اصحاب بنفس نفیس تشریف لانا چاہیں وہ صرف اتوار کے دن زحمت کریں۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)